شمعِ فروزاں

(چند علمی اور ادبی شخصیتوں کے حالاتِ زندگی اور کارنامے)



مُرتّبہ:

عُمر خالدی

آغا خان لائبریرین
جیساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی
کیمبرج (ممالک متحدہ امریکہ)

ناشر:
عزمی اینڈ سنس مہدی پٹنم۔ حیدرآباد

نام کتاب : شمع فروزاں
مرتب : عمر خالدی
ناشر : عزمی اینڈ سنس

کتابت : محمد عبدالرؤف
سرورق : سلام خوشنویس

طباعت سرورق اور تصاویر : سُرور آفسٹ پریس
طباعت لیتھو : دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد
باراوّل : پانچ سو
سنہ اشاعت : جنوری ۱۹۹۲ء م رجب ۱۴۱۲ھ
تصاویر : [illegible] فوٹو اسٹوڈیو یاقوت پورہ
قیمت : عام خریداروں کے لیے : تیس۳۰ روپے (RS. 30/=)
بک سیلرز و لائبریریز کے لیے : ساٹھ۶۰ روپے (RS. 60/=)

ملنے کے پتے :
○ اسٹوڈنٹس بک ڈپو، چارمینار - حیدرآباد
○ حُسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد
○ محبوب علی خاں اخگر "نصیب منش" ۲/ ۱۷/۲۶۲-۳-19
جہاں نما. حیدرآباد ۵..۲۵۳

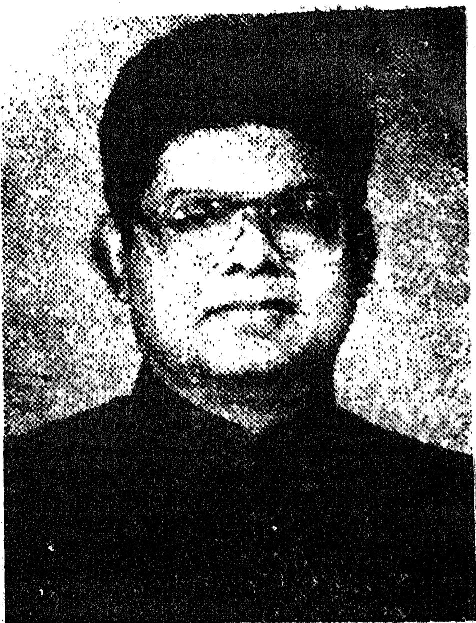
فہرستِ مضامین



"کتنی عظیم اور شفیق ہستیاں، کتنے پُر خلوص اور ہمدرد لوگ، کیسے وقار اور تمکنت والے چہرے، کتنے تابناک واقعات، کتنی فکر انگیز یادگار صحبتیں، کتنی خیال آفریں اور گرم مجلسیں، کیسی کیسی علمی ادبی اور شعری محفلیں میرے لیل و نہار کا جزو بن چکے تھے! انھیں ہی ڈھونڈ کر لاؤں کہاں سے؟!

افسوس کہ حیدرآباد ایسے عالی مرتبت بندگانِ خدا سے خالی ہوتا جا رہا ہے جو نہ صرف حیدرآباد بلکہ مسلمانوں کے لیے باعثِ صد افتخار و ناز تھے جن سے شعر و ادب کی آبرو اور علم و عرفان کا وقار تھا۔!"

خواجہ معین الدین عزمی



مُرتّبہ

عُمر خالدی ابن ڈاکٹر ابوالنصر محمدؐ خالدی مرحوم



ڈاکٹر خالدی



مبارز الدین رفعت



مولوی قطب میاںؒ



سید یوشع



خواجہ معین الدین عزمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنتساب

میں اس کتاب کو اپنے والدین کے نام معنون کرتا ہوں جن کی مشفقانہ تعلیم و تربیت اور مخلصانہ دُعاؤں نے مجھے عِلمی خدمت اور تصنیف و تالیف کے قابل بنایا۔ خاص طور پر والد علیہ الرحمتہ کی گراں قدر رہبری کے طفیل میں نے حیدرآباد دکن کی تاریخ اور تہذیب سے متعلق موضوعات سے اپنی قلمی زندگی کا آغاز کیا۔

عمر خالدی

پسر

ڈاکٹر الحاج ابوالنصر محمد خالدیؒ

عرضِ مرتب

مجھے جو کچھ کہنا تھا یا جو کچھ لکھنا تھا وہ تو میرے شفیق استاد محترم جناب خواجہ معین الدین صاحب عزمی نے اپنے جواہر پاروں میں تحریر فرما دیا۔ ان کی شخصی دلچسپی اور توجہ سے کتاب کی اشاعت میں تاخیر، تعجیل سے بدل گئی اور اس طرح میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ ان کی ذات گرامی نے کتابت اور طباعت کے سارے مرحلے اپنی تنہا کاوشوں سے طے کر کے اس بیش قیمت اثاثے کو زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اگر ان کی دلی لگن، محنت اور کوشش شامل نہ ہوتی تو آج یہ "شمع فروزاں" آپ کی محفل کی رونق نہ ہوتی!

میرے یہاں آں جناب کی مساعی جمیلہ اور محنت شاقہ کے اعتراف اور سپاس گزاری کے لیے کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ "کیا عرض کروں؟"

مضامین میں زندگی کے اعلیٰ نصب العین کی رہنمائی ملتی ہے جس کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان بزرگ ہستیوں نے طالب علموں کی تدریس کے ساتھ ساتھ اپنی تحقیقی، تخلیقی اور تبلیغی کاموں کا سلسلہ آخری سانس تک جاری رکھا۔ ان کی فکر و سیرت کا مطالعہ کرنے والے خصوصاً طلباء ان خوبیوں اور اصولوں کو اپنائیں جن کی بدولت یہ شخصیتیں علم و ادب کی دنیا میں روشنی کا مینار نظر آتی ہیں!

عمر خالدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝

[غور کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں]

مُقدمہ

قبل اس کے کہ کتاب سے متعلق کچھ باتیں کی جائیں، وجہ تحریک اور ترتیب و تدوین کے بارے میں اجمالاً یہ عرض کرنا ہے کہ عزیز گرامی قدر جناب عمر خالدی صاحب کو اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد بار بار یہ خیال آتا رہا کہ ان کی مکمل سوانح حیات اقربائے خاندان، تلامذہ، احباب اور رفقاء کی معلومات اور استفادہ کے لیے مرتب کروائی جائے تاکہ ان کے پیار و محبت، خلوص و شفقت اور تعلیم و تربیت کی قدر شناسی اور ادنیٰ درجہ میں شکر گزاری کا حقیر نذرانہ کتابی شکل میں بطور یادگار محفوظ رہے۔ انہوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، کہیں سے اُمید کی کرن نظر نہیں آئی۔ پھر مجھ سے خواہش کی۔ عذر و معذرت، ٹال مٹول کے بعد بالآخر یہ اہم ذمہ داری مجھ جیسے غیر معروف، گوشہ نشین، گمنام پر پڑی۔ مرتا کیا نہ کرتا "باتیں ان کی اور یادیں اپنی" یوں تیوں اپنی سی کوشش و جرأت کے بعد چل رہے خامہ بسم اللہ کہہ کر چند صفحات سیاہ کر ڈالے اور اس طرح مختصر حالاتِ زندگی قلم بند ہو گئے۔ تاکہ آئندہ کسی قابل سوانح نگار کو ان بنیادی نقوشِ حیات سے مدد مل سکے اگر ایسا ہو جائے تو سمجھوں گا کہ میرے مقصد کی تکمیل ہو گئی۔ پھر تجویز یہ رہی کہ قریبی تعلقات رکھنے والی چند اور ہستیوں کے بارے میں بھی مضامین اکٹھے ہو جائیں تو ان گلِ سر سبد شخصیتوں کی مختصر سوانح سے فضاء اور بھی مہک اُٹھے گی چنانچہ وہ مضامین جو دسترس میں آسکے کتاب میں شامل ہیں۔

اس بات کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا کہ خالدی محترم پر چند سطریں کیا

لکھیں کہ اس کتاب کی پیش کشی پر مقدمہ کے لیے بھی خامہ فرسائی کرنی پڑی۔ دیکھیے اس کوچہ میں کیسے گزر ہوتا ہے۔

جن مقدس ہستیوں اور اکابر شخصیتوں کے مختصر حالات اور علمی ادبی دینی اور ملی کارنامے ان اوراق کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان سب کا تعلق مادر علمیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن اور دارالترجمہ سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہا ہے سوائے مولوی جمیل الدین احمد علیہ الرحمۃ (راجہ حضرت) کے۔ لیکن انھیں بھی جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اکرام مولانا سید ابراہیم ادیب اور مولانا سید عبدالقدیر حسرتؒ سے تلمذ حاصل تھا۔ اس اعتبار سے ان کی نسبت بھی جامعہ سے بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ ضرور پائی جاتی ہے! البتہ ابوہاشم سید یوشع مرحوم مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے متعلم اور جامعہ مدراس کے معلم تھے۔ یہ رفعت محترم کے رشتہ کے چچا تھے۔ افسوس کہ ان کے بارے میں بہت ہی ادھورے اور مبہم معلومات ہیں۔ اپنی کم عمری اور ہیچمدانی کے باوجود ان میں سے بعض بزرگوں کی خدمت میں خاکسار کو طویل عرصہ تک رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ سب کے سب اپنے اپنے جداگانہ علوم وفنون، ادب وشاعری، السنہ شرقیہ، تفسیر قرآن، شریعت اور طریقت کے تدریسی اور تربیتی میدان کے ماہرین تھے۔ انھوں نے مختلف النوع موضوعات کی ترویج واشاعت کے لیے اپنی عمریں وقف کردی تھیں۔ اس لیے میں آغاز گفت وگو اور اظہار خیال کے طور پر علم، عالم اور حکمت و دانش سے متعلق چند قرآنی آیات، احادیث اور اقوال سپرد قلم کرتا ہوں جو فی نفسہٖ ذیلی عنوانات کا درجہ رکھتے ہیں۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا [۲۔ البقرہ۔ ۳۱] اور سکھائے آدم کو نام سارے۔ وَقَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ (۲۷۔ النمل ۴۰) جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا: وہ (تخت) میں آپ کے پاس لے آتا ہوں۔ تنزیل کی اس آیت مبارکہ

میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ملکہ سبا کے تخت کو لانے میں جس قوت کو در حقیقت دخل تھا وہ علم تھی۔

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۹۶۔ العلق ۴ و ۵) علم سکھایا قلم سے۔ سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کمیل سے کہا: یَا کُمَیْلُ اَلْعِلْمُ خَیْرٌ مِنَ الْمَالِ، اَلْعِلْمُ یَحْرُسُکَ وَ اَنْتَ تَحْرُسُ الْمَالَ، وَالْعِلْمُ حَاکِمٌ وَالْمَالُ مَحْکُوْمٌ علیه، وَالْمَالُ تنقصه النَّفَقَۃُ وَالْعِلْمُ یزکوا بِالْاِنفاق۔ اے کمیل! علم مال و دولت سے کہیں بہتر ہے کیوں کہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے اور مال کی حفاظت تم کو کرنی پڑتی ہے۔ علم حاکم ہے اور مال محکوم علیہ۔ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے اور علم پھیلانے سے اور خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ یہ شعر بھی حضرت علیؓ سے منسوب ہے ؎

ففز بعلم تعش تحیا بہ ابدا ؛ الناس موتی واہل العلم احیاء

علم سے بہرہ مند ہو ہمیشہ زندہ رہوگے ؛ بے علم سب لاشیں ہیں اور اہلِ علم زندہ ہیں

حاکم نے تاریخ نیشاپور میں ذکر کیا ہے:-

اَلْاِیْمَانُ عُرْیَانٌ وَ لِبَاسُهُ التَّقْوٰی وَ زِیْنَتُهُ الْحَیَاءُ وَ ثَمَرَۃُ الْعِلْمِ ایمان عریاں ہے اور اس کا لباس تقویٰ ہے۔ اس کی زینت حیا ہے اور ثمرہ علم۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ قرآن حمید کی اس آیت دعا رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲۔ البقرہ ۲۰۱) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ دنیا کے حسنہ سے مراد علم اور عبادت ہے اور آخرت کے حسنہ سے مراد جنّت ہے۔

حصولِ علم بھی با مقصد ہونا چاہیئے نہ کہ بقول مولانا حالیؒ گونگے کی طرح گڑ کھایا کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا! ہمارے لیے زندگی میں علم کی

ضرورت ایسی ہی ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ، وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قوی کو ساکن و پژمردہ کردے۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجے بہتر ہے۔ [رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ۱ بابت یکم شوال ۱۳۱۱ھ]

اب علماء کے متعلق ارشادات پر غور فرمائیے :۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ [۳۵۔ الفاطر ۲۸] اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جن کو سمجھ ہے یا جن کو علم بخشا گیا۔

حدیث شریف اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءُ [ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان میں ہے] علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ ایک صاحب کا قول ہے :۔

العلماء سرج الازمنۃ کل واحد مصباح زمانہ یستضیٔ بہ اھل عصرہ۔

علماء اپنے اپنے زمانے کے چراغ ہیں اور ان سے ہر ہر زمانے میں لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں۔

یوزن یوم القیامۃ مداد العلماء بدم الشھداء

[ابن عبدالبر] کا مطلب : قیامت کے روز علماء کی روشنائی کو خون شہداء کے ساتھ تولا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روشنائی کا وزن شہدا کے خون سے بڑھ جائے گا۔ اس سے مصنّف کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ بعض حکماء فرماتے ہیں کہ عالم رہتا ہے تو اس پر مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں روتے ہیں۔ عابد اور زاہد پر علمائے دین کی فضیلت بھی احادیث سے مروی ہے۔

قوت بیانیہ اللہ کی ایک نعمت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ۔ [۵۵۔ الرحمٰن ۲] انسان کو اللہ نے پیدا کیا [اور] سکھائی اس کو بات یعنی اسے اظہار مطالب کی صلاحیتیں

بخشیں۔

دانش و حکمت کی باتیں موتی سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں :۔ لَا تُعَلِّقُوا الْجَوَاهِرَ فِيْ أَعْنَاقِ الْخَنَازِيْرِ تو اپنے موتی سوروں کی گردنوں میں نہ ڈال۔

ایک حکیم سے پوچھا گیا کہ تم مال کی کونسی قسم جمع کرنا چاہتے ہو۔ اس نے جواب میں کہا :۔ اَلْأَشْيَاءِ الَّتِيْ إِذَا غَرِقَتْ سَفِيْنَتُكَ سَبَحَتْ مَعَكَ۔ کہ ایسی چیزیں کہ جب تمہارا سفینۂ حیات ڈوب جائے تو وہ تمہارے ساتھ تسبیح میں مشغول رہیں یعنی علم و حکمت۔

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرمایا کرتے تھے :۔ میرے سینے میں بہت سے علوم جمع ہیں کاش کوئی ان کا حامل مل جاتا! انھوں نے سچ ہی فرمایا کیوں کہ قُلُوْبُ الْأَبْرَارِ قُبُوْرُ الْأَسْرَارِ۔ پاکیزہ دل کے سینے اسرار کا مدفن و گنجینہ ہیں۔

اُوپر کی سطروں میں جو اجمالی اشارے ہیں ان میں دریا کی وسعت ہے۔گویا" سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!" ان آبدار موتیوں کی قدر و قیمت جاننے کے لیے جوہر شناسی کی ضرورت ہے۔ حکومت کے خزانے اور زر و جواہر کی بارگاہیں علوم و فنون کی سرپرستی کرسکتی ہیں لیکن علم دفن دے نہیں سکتیں۔ علم ایک عطیۂ خداوندی ہے جس کو وہی دل و دماغ قبول کرسکتے ہیں جن کو اس کے قبول کرنے کی صلاحیت بھی بخشی گئی ہو۔

تاریخ کے اُفق پر ہر فکر، ہر علم و ہر فن، ہر صنعت و دستکاری اور سائنس کے ہر شعبے کی ریاست گیر، ملک گیر اور عالمگیر شخصیتیں اُبھریں جنھوں نے تہذیب و ثقافت اور ذہنی ترقی کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ ہم جانتے ہیں ایک کسان دھرتی، ہل اور بیجوں کے درمیان نیلے گگن کے تلے اپنی صبر آزما محنت اور مشقت کو اپنا کر خون پسینہ ایک کرتا ہے۔ ایک لوہار آگ اور لوہے کے بیچ زندگی گزارتا ہے۔ کمہار کی زندگی پر غور کریں

تو وہ گیلی مٹی، چاک اور بھٹی کے بیچ اپنے شب و روز بِتاتا ہے اور اپنے ہاتھ کے ہنر اور گلکاریوں سے قابلِ رشک فنی خوبصورتیوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایک مصوّر کینوس اور رنگوں کے بیچ، اور ایک سنگ تراش تیشہ اور پتھر کے درمیان اپنی زندگی کے قیمتی لمحات صرف کر کے حُسنِ تخیل، کاریگری اور آرٹ کے خوبصورت اور نادر نمونے تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح ایک معلم مصنّف، ادیب یا شاعر، مفکر یا دانشور کی زندگی قلم اور کتابوں کے درمیان فکر و تدبیر، حکمت و دانائی کے نئے چراغ روشن کرنے میں گزرتی ہے۔

معلّمین ہی ملّت کے وہ خیر خواہ اور فیض رساں علمی سرپرست ہیں جو طالب علموں کے اندھیرے ذہن کو ذکاوت اور علم کی شمع سے منوّر کرتے ہیں۔ جہاں استاد کو اندازہ ہوا کہ فلاں ذہن کی مٹی ذرا نم ہو تو بہت زرخیز ہو سکتی ہے تو علم کی نہر سے اس کی مناسب آبیاری کی جاتی ہے جو آگے چل کر خود ایک مثالی گلشن بن جاتا ہے۔ معلّم اور متعلم یا مرشد و مسترشد میں درحقیقت وہی مثال ہے جو مُہر اور درخت کی شاخ میں ہے۔ اگر مُہر میں نقوش پہلے سے قائم ہوں تو یہ ان کو دوسری جگہ مرتسم بھی کرسکے گی ورنہ نہیں۔ بعینہٖ یہی معاملہ شاخ کا ہے۔ اگر یہ سیدھی ہوگی تو سایہ بھی استوار ہوگا ورنہ نہیں۔ ٹیڑھی شاخ سے سائے اور چھاؤں کی امید کیوں کر کی جاسکتی ہے۔ ایک اور مثال سے بھی بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو شمع خود روشن ہوتی ہے وہ دوسروں کو روشنی دیتی ہے۔ جو آپ خود بجھی ہوئی ہے یا ٹمٹمارہی ہے وہ دوسرے کے لیے روشنی بخش کیسے ہو سکتی ہے؟

خداداد ذہنی صلاحیتوں کی تربیت کے لیے سازگار ماحول ملے تو زندگی کا رُخ ہی پلٹ جاتا ہے۔ عظیم مفکّر افلاطون کی عمر جب بیس برس کی تھی تو وہ اپنے استاد سقراط کے زیرِ اثر آگیا۔ وہ پہلے ہی سے اپنے عہد کے متاعِ علمی سے بہرہ اندوز تھا لیکن سقراط کی زندگی اور موت کا اس پر گہرا اثر پڑا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی علمی بصیرت نے اس

کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:

"انسانی زندگی، جماعتی زندگی ہے۔ ساری ذہنی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ اجتماع میں یا کم سے کم دو تی سے پیدا ہوتی ہے حیاتِ انفرادی کا پودا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے۔ من و تو، دونوں یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں...... ماں ہی اپنی محبت اور شیفتگی سے بچے کی ذہنی زندگی کو وہ متاع گرانمایہ دے سکتی ہے جس کا بدل دنیا کی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اچھا استاد شاگرد سے اور اچھا شاگرد استاد سے، سچا گرو چیلے سے اور سچا چیلا گرو سے وہ منازل ذہنی و روحانی طے کرا دیتا جو اس کے بغیر ناقابلِ تصور ہوتے ہیں۔ جس زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضراب نہیں چھیڑتا اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں۔ جس زندگی کی کلی کو دوسری زندگی کی حیات بخش نسیم نہیں نصیب ہوتی، وہ شگفتہ ہونے کی جگہ مرجھا جاتی ہے فلاطون کی زندگی کی کلی اس وقت کھلی جب اس پر اس انوکھے بوڑھے سقراط کی نظرِ بہار اثر پڑی"۔

["ریاست" مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین (مقدمہ)]

دُنیا کا سارا حسن اور خوبصورتی، اس کی تاریخ کی رونق، اس کی تہذیب کی ساری عظمت، ان لوگوں کی مرہونِ منت ہے۔ جنھوں نے اپنی لگاتار محنت اور عرق ریزی سے کام لیا۔ ایثار کیا، قربانیاں دیں۔ دولتِ دنیا لٹائی۔ علم کی دولت بانٹی تاکہ رنگِ کائنات خوب نکھرے اور کبھی آلودہ نہ ہو۔

سماج میں استاد کا بہت بلند، قابلِ تعظیم، لائقِ احترام اور عظیم مرتبہ ہوتا ہے۔ بعض سنسکرت صحیفوں میں استاد کو الوہیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ "استاد کو صرف ایک معلّم کے روپ میں نہیں دیکھا جاتا بلکہ اسے شخصیت کا

معمار مانا جاتا ہے"۔ یہ فقرے پڑھنے اور سننے میں بہت خوش گوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقت کا وجود اس وقت پایا جاتا تھا جب نظام تعلیم میں یگانگت اور یکجہتی کا جذبہ تھا۔ مذہبی تعصب سے پاک اور سیاست کے عمل دخل سے مبرا تھا۔ استاد محض نصابی کتاب کے درس آموز نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ وہ ادب آموز بھی ہوتے تھے جس کی وجہ سے پرانی تہذیبی قدریں بھی زندہ اور تابندہ تھیں۔ ان کے اخلاق و عادات کردار و سیرت کا طالب علموں پر بڑا اثر پڑتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ سیرت کا حسن و جمال دنیا کے تمام دوسرے حسن و کمال سے افضل ہوتا ہے لیکن غور کیجیے کہ کیا آج کل بھی سابق کی طرح سیرت سازی پر ویسی ہی توجہ دی جاتی ہے؟ ہم بڑی بے باکی سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ان جملوں کا ضرور استعمال کرتے ہیں جیسے مثلاً "اساتذہ قوم کے معمار، تاریخ ساز اور تقدیر ساز ہوتے ہیں۔" "استاد کو روحانی باپ کا درجہ حاصل ہے۔ ہم کو استاد کی عزت کرنی چاہیے۔ ادب سے پیش آنا چاہیے"۔ پہلے ان جملوں میں لفظ بہ لفظ معنوی حقیقت تھی اور بے شک ایک تعمیری پہلو بھی تھا۔ مگر اب ان کا مفہوم بدل گیا ہے اور منفی پہلو نمایاں ہے۔ دورِ حاضر میں اب یہ باتیں ناپید ہیں اور فسانہ معلوم ہوتی ہیں۔ قدیم امتیازی قدریں ایک ایک کر کے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارے فکری سانچے بدل گئے، طرزِ عمل بدل گیا! آزادی سے قبل اور اس کے بعد کے تعلیمی نظام میں بعد المشرقین ہے۔ جدید ذہن کے بعض روشن خیال لوگ تو استاد کے ادب و آداب کی قدیم روایات کو دور کہن کی فرسودہ رسم تصور کرتے ہوں گے۔ بہر حال ہم تو اس قول کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں کہ "با ادب با نصیب، بے ادب بے نصیب"۔ اس کی مزید تفصیل میں جانا اصل موضوع سے گریز اور ناانصافی ہوگی۔ تذکرۃً بات سے بات نکلی اور ذرا طول ہو گئی۔ زیرِ نظر کتاب میں جن کی روداد حیات مشکلات سے

نجات کے پیام کے ساتھ اُمنگ، ولولہ، جوش اور حوصلہ پیدا کرتی ہے، جس سے ضمیر بیدار، روح بالیدہ اور عقل روشن ہو جاتی ہے، وہ اسلامی اقدار کے پاسباں اور قدیم تہذیب اور وضع داری کے محافظ تھے۔

جس طرح کسی فن کار کی پہچان اس کے فن پارے سے ہوتی ہے اسی طرح کسی معلّم، مصنّف، مفسّر، مبلغ، مفکّر اور مدبّر کی شناخت اس کے فضل وکمال، عظمت ورفعت، علم وعرفان، افکار وعزائم کے علاوہ اس کے ہم نشینوں، شاگردوں، تصنیفوں، تالیفوں اور علمی وتحقیقی شہ پاروں سے ہوتی ہے۔

ان پہلوؤں سے قطع نظر نمودِ حیات کی تفسیر یا جمودِ حیات کی تصویر صرف تذکروں اور سوانحوں ہی میں نہیں ملتی بلکہ مکاتیب اور ذاتی خطوط کے ذریعہ بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ سیموئل جانسن نے کہا ہے کہ "مکتوب نگاری سب سے زیادہ ایماندارانہ طرزِ اظہار ہے۔" مکتوب نگار خط لکھتا ہے تو اس میں اس کی اور مکتوب الیہ کی ذاتی زندگی کی بہت سی نجی اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ خطوط ہی وہ آئینہ ہیں جن میں ہم مکتوب نگار کی شخصیت کی جھلکیاں صاف دیکھ سکتے ہیں۔ خطوط میں لکھنے والے کے دل کے سارے رازہائے پنہاں آشکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی پسند ناپسند، اخلاص ومحبت، نفرت وحقارت، غصہ وعداوت، احترام وعقیدت، عقائد وافکار، نظریات وتصورات غرض یہ کہ اس درپن کے سامنے تکلف برطرف ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ خطوط کے مطالعہ سے مکتوب نگار کے اسلوب تحریر، زبان کی سلاست اور بیان کی شگفتگی کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر زبان میں حلاوت اور بیان میں شیرینی ہو تو ایسے خطوط میں عجیب نغمگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ کسی شعر کے گنگنانے سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ ایسا خط پڑھنے سے لطف آتا ہے۔ جس کا اظہار رہن سہن یا کسی مضمون کے ذریعہ نہیں ہو سکتا وہ خطوط کی وجہ سے افشا ہو جاتا ہے۔ یہ خطوط ہی تو

ہوتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ "سرآئینہ کچھ اور ہے پسِ آئینہ کچھ اور ہے"
شاید اسی لیے دوسروں کے خطوط کا بلا اجازت پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔
لیکن علمی اغراض کے لیے غالباً نہیں! جب دو علمی یا ادبی شخصیتوں کے
درمیان خط و کتابت ہوتی ہے تو خانگی باتوں کے علاوہ علمی مسائل
اور دیگر ادبی گتھیوں کا الجھاؤ اور سلجھاؤ معلوماتی اور تحقیقی دلچسپیوں
کا خزانہ ہوتا ہے۔

اس موقع پر خاکسار کے نام رفعت محترم کے ایک شفقت نامہ کا
اقتباس پیشِ خدمت ہے:۔

میسور　　　　۸ر جون ۱۹۷۱ء

عزیز گرامی قدر میاں عزمی سلمہٗ

بعد دعائے درازیٔ عمر و درجات، آپ کا ۲۷ر مئی کا مکتوب
محبت نامہ مِلا۔ یاد آوری اور کرم گستری کا سپاس گزار ہوں۔
ادھر تقریباً دو ہفتوں سے پھر خون کا دباؤ کافی بڑھ
گیا تھا۔ لکھنا پڑھنا سب بند تھا۔ آپ کے کرم نامہ کا فوری
جواب لکھنے کی دلی خواہش کے باوجود آپ کو جلد نہ لکھ
سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے جس خلوص اور جس محبت کے ساتھ میری علمی
کاوشوں کو سراہا ہے اس سے مجھے ایک گونہ خوشی اور اس
سے زیادہ شرمندگی ہوئی۔ یقین مانیئے ایک زمانہ وہ بھی
تھا کہ اپنی تحریروں کو وقعت دیتا تھا، اور اپنے آپ کو علمی
دنیا کے شہ سواروں میں گن لیتا تھا۔ لیکن ادھر زمانے سے
ایسا رگیدا اور ایسا پیسا کہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے
آگئی اور اپنا مقام بھی معلوم و محسوس ہو گیا۔ اب اپنی تمام
تحریریں خود اپنی نظر میں بے وقعت اور ہیچ ہو گئی ہیں!

اب نہ لکھنے کی ہوس باقی ہے اور نہ اس کی توقع ۔ ہاں
بقول آپ کے آوارہ خوانی اب بھی جاری ہے، بیشتر بے دلی
یا نیم دلی کے ساتھ۔ یہی آوارہ خوانی ایک عمر کی عادت ہے
اس سے رستگاری ممکن نظر نہیں آتی۔

آپ کے علمی شوق کا حال جان کر دلی خوشی ہوئی۔ میری
دلی آرزو ہے کہ اسی علمی آوارہ خوانی کے کرشمہ کے طور پہ
آپ بھی ایسا کوئی علمی یا ادبی کارنامہ چھوڑ جائیں۔

السلام اے بعد ما آئندگان د رفتنی
برشما خوش باد نا خوش ہائے دنیائے دنی

والسلام مع الاکرام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
دعاگو

مبارز الدین رفعت

یہ ان کی نوازش اور حسنِ ظن تھا۔ شاید ان کی دلی آرزو اور دعاؤں
کا اثر تھا کہ یہ چند سطریں لکھ کر ہدیۂ نیاز گزراننے کی توفیق ہوئی ۔
کاش وہ آج زندہ ہوتے! کوئی بڑا کام تو نہ کرسکا۔ "آئندہ تا نہ بخشند
خدائے بخشندہ" کے کرشمہ کا ظہور ہو تو ہو! بندۂ عاجز فضل کا طلب گار
ہے۔ غور فرمایئے کہ اتنے کثیر تراجم اور تصانیف اور ادبی سرمایہ کے باوجود
اپنے بارے میں کس انکسار کا اظہار فرما رہے ہیں۔ سچ ہے کہ شاخِ ثمردار
ہی جھکی ہوتی ہے۔ ارسطو کا یہ قول کس نے نہیں پڑھا "میں صرف اتنا جانتا
ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا"۔ آپ نے میر کے یہ شعر تو ضرور سنے ہوں گے

ملئے اس شخص سے جو آدم ہووے ۔ ناز اس کو کمال پر ذرا کم ہووے
ہو گرم سخن تو گرد آوے اک خلق ۔ خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

یہ مجموعہ مضامین طباعت کے مرحلے میں تھا۔ مجھے جست دجو بھی
تھی اور کام بھی نکل آیا تو میسور جانا پڑا۔ یہ سفر اس اعتبار سے بہت

مبارک رہا کہ رفعت محترم کے نام خطوط کے ذخیرۂ کثیر کے دیکھنے کا موقع ملا یہ گرانمایہ شخصیت خزاں و بہار لئے ہوئے لالۂ و گل میں نمایاں ہونے کے لئے عارضی وطن میسور ہی کی خاک میں (۱۹۷۶ء میں) پنہاں ہو گئی۔ اس کے بعد سے غالباً آج تک کسی نے ان کے نام مکتوبات کی کھوج نہیں کی تھی۔ کسی کو ضرورت بھی کیا تھی؟ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ ان میں کچھ خزانہ دفن ہے! کاروباری طرز کے یا غیر ادبی خانگی خطوط علاحدہ کرنے کے بعد باقی ماندہ خطوط کی دنیا خود ایک چھوٹا سا ادبی جزیرہ ہے۔ نمونے کے مطبوعہ خطوں سے میرے قول کی تصدیق ہوگی۔ مختصر قیام میں میرے ہاں وقت کی شدید قلت تھی۔ جتنا بھی وقت ملا، غنیمت جانا اور خطوط کے انبار میں سے بڑی کدوکاوش اور دیدہ ریزی کے ساتھ کانٹ چھانٹ کرنے میں کیسے وقت گزرا، خبر نہ ہوئی۔ سوچا کہ ان خطوں کو اس کتاب میں شامل کر دوں تو موجودہ مکتوب نگاروں کے علاوہ اہلِ ذوق اور ادبی قدر والوں کے لیے بیش قیمت تحفہ سے کم نہ ہوگا۔ اِسی طرح میرے دریافت کردہ خالدی محترم کے موسومہ خطوں کو بھی متعلقہ مضمون کے درمیان بڑھا دیا جن میں اہم کم یاب اور قابلِ ذکر مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا ابو الخیر مودودی مرحوم کے خطوط ہیں۔ ان خطوط کی تحریروں کی قدامت اور کم یابی کی وجہ سے شاید انھیں نادر بھی تصور کیا جائے۔

ارادہ تو یہ تھا کہ اطمینان اور فرصت سے رفعت محترم کے ذاتی خطوط فراہم کر کے جوابی خطوں کے ساتھ منتخبہ مکتوبات کو کتابی شکل میں شائع کروں لیکن اس خیال سے کہ یہ کام بہت وقت طلب ہے اور کسے معلوم ہے

کوچۂ یار میں اب جانے گزر ہو کہ نہ ہو
وہی وحشت، وہی سودا، وہی سر ہو کہ نہ ہو

جو بھی دامن میں آئے ان میں سے چند خطوں کو بھولی بسری یادوں کی

تازگی اور لطافتِ ایامِ ماضی کی خاطر اسی مجموعہ مضامین میں بغیر کسی تاخیر کے زیبِ عنوان کرنا مناسب سمجھا۔ کیوں کہ ؏

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے!

اردو ادب اور اسلوب کے شیدائیوں اور ان کے پرستاروں تک پہنچانا میرا فرض بھی ہے۔ ان مکتوب نگاروں میں آسمانِ علم و ادب کے آفتاب و مہتاب بھی ہیں اور درخشاں ستارے بھی، جن کی چمک سے جبینِ اردو روشن ہے۔ کسی کی شخصیت تعارف کی محتاج معلوم نہیں ہوتی لیکن ایک عام قاری کی معلومات کے لیے سرسری ذکر ضروری ہے۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو برصغیر ہند و پاک کے علاوہ بیرونی ممالک میں معروف و مقبول ہیں۔ سید امتیاز علی عرشی صاحب، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، ڈاکٹر زور مرحوم، ڈاکٹر خالدی مرحوم، شان الحق حقی صاحب، ڈاکٹر مسعود حسین خان صاحب اور عزیز احمد صاحب (کراچی) کو کون نہیں جانتا؟ کس نے ان کی تحریریں نہیں پڑھیں؟ عزیز احمد صاحب (سابق استاد جامعہ عثمانیہ) اپنے متعدد ترجموں، افسانوں، ناولوں جیسے مثلاً "ارسطو: فن شاعری"، "معمارِ اعظم"، "بیکار راتیں"، "شبنم"، "تری دلبری کا بھرم"، "ایسی بلندی ایسی پستی"، "آگ"، "برے لوگ"، "اقبال (سوانح)"، "دانتے" اور "گریز" کی وجہ سے اجنبی نہیں ہیں۔

محترمہ زہراء حیدر، سید سجاد حیدر یلدرم کے چھوٹے بھائی سید نصیر الدین حیدر کی صاحبزادی ہیں۔ ناولوں کی دنیا کو سب سے تابناک بنانے والی گیان پیٹھ انعام یافتہ محترمہ قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان کے ناولوں کی ایک لمبی فہرست ہے "میرے بھی صنم خانے"، "سفینۂ غمِ دل"، "پت جھڑ کی آواز"، "کارِ جہاں دراز ہے"، "آگ کا دریا"، "گردشِ رنگِ چمن"، "چاندنی بیگم" وغیرہ کس کی نظر سے نہیں گزرے۔ "جب یلدرم نمبر" مرتب کیا جا رہا تھا تو مراسلت کا سلسلہ رہا۔ طوالت کے خوف سے چند ہی خطوط کی نقلیں

دی گئیں۔ جو خود اپنے آپ ترجمان ہیں۔

پروفیسر فاروقی صاحب اپنے مضامین، مقالوں، کتابوں جیسے مثلاً "تین تذکرے" "میر کی آپ بیتی (ترجمہ)" "دید و دریافت" "تلاش میر" "میر تقی میر" کے علاوہ اہم دینی و ملّی اجلاسوں، کانفرنسوں اور مذاکروں کو گرمانے والی شخصیت کو کون نہیں پہچانتا؟ ان کے "مودت ناموں" میں جو قریباً تین دہے قبل کے تحریر کردہ ہیں صریرِ خامہ نوائے سروش بن گیا ہے۔ گہری دوستی، وارفتگی اور جذبۂ فدائیت علانیہ ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفعت محترم کی دردمندی اور غمخواری ان کے لیے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تھے اور ان کا "خلوص و محبت زندگی کا اندوختہ"! ان کے خطوط کی تعداد دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں سوائے خطوط نویسی کے اور کوئی مصروفیت نہیں تھی لیکن ان کے باوصف پتہ نہیں دوسرے علمی اور تحقیقی کاموں کے لیے کیسے وقت نکالا ہوگا۔ ان میں حکایت غمِ دل بھی ہے اور شکایت زمانہ بھی! انھیں معلوم ہے کہ ؎

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

خطوط میں اندازِ بیان، لطفِ زبان اور بے ساختگی ایسی ہے جیسے کسی نے نثر میں شاعری کی ہو۔ انھیں تو یاد بھی نہ ہوگا کہ کب کیا لکھا تھا۔ آج ان کی نظر سے جب یہ خطوط گزریں گے تو "افکار امروز" میں ماضی کے جھروکوں سے جھانکنے والی یہ یادیں "فسانۂ دیروز" معلوم ہوں گی۔ ذہن کے اس طویل سفر کے بعد ضرور احساس ہوگا کہ ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب   چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ہم جانتے ہیں کہ مکاتیب کا شمار ادب میں نہیں، ادبِ لطیف میں ہوتا ہے اور اگر مکاتیب اچھے ہوں تو بقول شخصے ان کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہونا چاہیے۔ اسی لیے رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ اچھا مکتوب

اچھی غزل کی طرح ہوتا ہے۔ کبھی کبھی پُر کیف اور دلپذیر بھی! ابھی خطوط زیرِ نظر ہیں آپ ہی اندازہ فرما لیجیے۔ اگر یہ سچ ہے کہ بسا اوقات مکاتیب ہی انسان کا قلم نہیں، دل بولتا ہے تو اس وسیلے سے فاروقی صاحب کے دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ویسا صاحبِ قلم ہونا بھی ضروری ہے۔ قلم دل کی زبان بن جائے تو بات بھی دل نشین ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی صاحب بھی "میکدۂ علم" کے بلانوش معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی فرصت سے لکھتے تھے نہایت طویل خطوط تفصیلاً لکھتے تھے اور کثرت سے لکھتے تھے۔ اور بہت کم بے مزہ! جن میں زیرِ مطالعہ کتابوں کے دو تین نام نہیں بلکہ تفصیلی فہرست، علمی اور تحقیقی کاموں کی تفصیل، قلمی مصروفیت، ڈرامہ نگاری، ناول نویسی ان کے اجمالی پلاٹ کبھی کسی کتاب کے ترجمہ کا ذکر تو کبھی کسی مفکر کے فکر و خیال پر تنقید وغیرہ غرض یہ کہ ایک جہان آباد ہے۔ انھیں سلسلہ وار جمع کریں تو "روحِ ادب و فلسفہ و ڈرامہ اور ناول" مرتب ہو جائے۔ یہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی قابل ترین نوبل انعام یافتہ نامور ہستی ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کے بھتیجے اور صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد ہیں۔ صفی صاحب فکرِ سخن بھی کرتے ہیں۔ لیکن تفریحِ طبع کی خاطر۔ شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں ہیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ بعض مکتوب نگاروں کو ان کے کسی خط کی اشاعت پر شکایت ہو اور وہ یہ کہہ اٹھیں ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

ادباً عرض کروں گا کہ کسی کے احساسات کو مجروح کرنا ہرگز منشا نہیں۔ ادبی افادیت کا پہلو پیشِ نظر ہے۔ دیگر مکتوب نگار اپنے خطوط کے

مضامین ہی سے آشکار ہیں اس لیے مکاتیب کی باتیں یہیں ختم کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ ان میں سے بعض خطوط نصف صدی قبل کے ہیں اور بعض کو ربع صدی سے زیادہ مدت گزر چکی لیکن ان میں گلِ تازہ کی خوشبو موجود ہے اور ایک دَور کی سوغات!

سوانح حیات مختصر ہی سہی لیکن ان میں زندگی کے سبھی گوشوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لکھنے والوں نے رشتے ناطے سے بالاتر ہو کر لکھا۔ محض قصیدہ خوانی نہیں کی بلکہ کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے مضامین کی ترتیب سال وفات کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔

زندگی کیا ہے؟ ایک عطیۂ الٰہی ہے ایک بیش بہا نعمتِ عظمیٰ ہے لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جنھیں اس کو گزارنے کا سلیقہ میسّر آجائے۔ کسی کی زندگی گزرتی ہے اور کسی کو زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ فلسفۂ حیات و موت بڑا وسیع موضوع ہے! ہر شخص کو زندہ رہنے کا طور طریقہ نہیں آتا۔ زندہ رہنا بھی ایک فن ہے۔ جو زندگی کے آداب سے واقف نہیں وہ کیا جانیں کہ زندگی کیسے بسر کی جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ساری زندگی کے لیل و نہار شادمانی اور عیش و عشرت میں گزریں۔ لطفِ حیات تو دُود کی کسک اور غم کے نشاط میں ہے! کبھی یہ مست خرامِ ناز ہے تو یہ کبھی آبلہ پا! اب کس کو کیا ملا یہ قسمت کی بات ہے۔ حیاتِ جاوداں کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ کس نے اپنی زندگی کو کس سلیقے اور کس قرینے سے بسر کیا۔ جن لوگوں نے معروف با مقصد اور کامیاب زندگی گزاری ہے یقیناً ان کے اصول سبق آموز اور قابلِ تقلید ہوں گے۔ قدرت کی دیگر مخلوقات کے علاوہ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے!

غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے ہر زمانے اور ہر خطے میں پیغمبر بھیجے۔ الہامی اور آسمانی صحیفے نازل کئے۔ مصلحین پیدا کئے۔ پند و نصیحت کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ اخلاق و کردار

کو سنوار نے کے اصولوں کی تعلیم عام کی گئی۔ انسانیت کا پیام پھیلا۔ لیکن ہر طرح کے نمایاں اوصاف، ستودہ صفات نیک و شائستہ ماحول اور صالحین کی صحبت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اگر اس کا موقع نہ ملے تو اس کے نعم البدل کے طور پر اولوالعزم اور برگزیدہ عظیم ہستیوں کے تذکروں، آپ بیتیوں اور سوانح عمریوں کا مطالعہ بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔ ان کے مطالعوں نے جینے کے ڈھنگ سکھائے اور زندگی میں حیرت ناک انقلاب پیدا کئے۔ خفتہ ذہنوں کو بیدار کیا۔ مردہ دلوں میں نئی روح پھونکی۔ مایوسیوں کو امیدوں سے بدلا۔ حرکت و عمل کا سبق سکھایا۔ مصیبتوں سے مقابلہ پر ابھارا۔ ہمت و جرأت پیدا کی۔ زندگی کو مقاصد عطا کئے اور مقاصد کو زندگی دی!

ہم کو یہی کچھ اس زیرِ نظر کتاب میں ملے گا۔ نصب العین حاصل کرنے کے لیے رہنمائی حاصل ہوگی۔ جدوجہد، علم و عمل، عالی حوصلگی، محبت و صداقت، شرافت و دیانت، عزم و استقلال، صحبتِ صالحین کی ایسی جھلکیاں اور ٹھوس حقائق کی ایسی مثالیں ملیں گی کہ ان سے کامران اور شادماں زندگی کی راہیں ہموار ہوں گی۔ کسی بھی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے مشاہدات، تاثرات، ناقابلِ فراموش تجربات اور واقعات کا جیتا جاگتا مرقع نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ لوگوں کے فضائل و خصائل کا علم ہوتا ہے اور انسانی فطرت اور سیرت کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔

اس کتاب میں شامل شخصیتوں کی سبق آموز حیات اور گراں بہا علمی خدمات ان کی زندگیوں میں شمع فروزاں رہی ہیں اور اس جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی رہیں گی۔ یہاں برسبیل تذکرہ خالدی محترم کے مضمون "جمال ہم نشیں۔۔۔" کی شانِ نزول کے بارے میں سید عبدالحفیظ صاحب کی تحریر کا اقتباس بطور حوالہ لکھوں تو نامناسب نہ ہوگا کیوں کہ انھوں نے شخصیات کو اپنا موضوع بہت کم بنایا۔ عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ

اس میں مولوی جمیل الدین احمدؒ کے ذکرِ جمیل کے ساتھ آں جناب کی آپ بیتیوں کا عکسِ جلیل بھی ہے جسے اپنی وفات سے دو سال پہلے دل فریبؔ عنوان کہتے تھے۔

"۱۹۸۳ء کی بات ہے۔ محبی نواب نورالدین خاں صاحب کی وساطت سے محترم خالدی صاحب سے مجھے پہلی مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔ بڑے ھان پان، ایک نحیف و نزار جسم میں عجز، انکسار، تواضع اخلاق وسادگی سے بھرپور شخصیت! علم و عرفان کا ایک ٹھیرا ہوا صاف و شفاف ساگر!... گزشتہ دو تین ماہ سے استاذی و مرشدی حضرت جمیل الدین احمدؒ کی ایک کتاب "قانون کا حقیقی تصور......" جو زیرِ طبع تھی اس سلسلہ میں مولانا مرحوم کے کسی قریبی ساتھی کی تلاش تھی اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ فی الوقت جناب خالدی صاحب کے سوا مولانا مرحوم کا کوئی اور مزاج داں و قدرشناس موجود نہیں!... ملاقات کی تمنا ابھی دعا بن کے لب تک آئی نہ تھی کہ اللہ نے سن لی.... محترم خالدی صاحب نے اپنی علمی مصروفیات، ناسازیِ مزاج اور کمزور صحت کے باوجود میری گزارش کو بلاتعین مدت ہی سہی مگر منظور فرمالیا! مولانا جمیلؒ کے تعلق سے خالدی صاحب نے جو لکھا ہے وہ صرف انہی کا حق تھا۔ اس مضمون میں مولانا جمیلؒ کی حیات کے جن گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے وہ کس قدر اہم تھے اس کا اندازہ مضمون پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مضمون چند در چند ناسا عد حالات کے باعث کتاب میں شامل نہ ہو سکا لیکن اگر موقع ملا تو انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں ضرور شامل کر دیا جائے گا۔

میرے نامہ اعمال میں اب تک اگر کوئی قابلِ فخر یادگار کارنامہ تھا تو وہ حضرت جمیلؒ کی خدمت میں حاضری اور ان کے فیضِ صحبت سے استفادہ کا کارنامہ تھا لیکن اس آخری عمر میں مجھ گنہ گار پر اللہ نے ایک اور عنایت فرمائی کہ مجھے نہ صرف خالدی صاحب کے شرفِ ملاقات

سے مشرف فرمایا گیا بلکہ آں محترم نے میری گزارش کی پذیرائی فرماکر اپنی گوناگو مصروفیات اور پیرانہ سالی کے باوجود مولانا جمیلؒ کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میرے حق میں گویا ایک انعام ہے جو اللہ نے محترم خالدی صاحب کے توسط سے مجھے عطا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ آں جناب کو تا دیر صحت، سکون و عافیت کے ساتھ اپنے اہل و عیال اور مجھ ایسے تشنہ کامانِ داستان ہائے پارینہ کی تشفی کے لیے سلامت رکھے۔ آمین۔"

احقر العباد
سید عبد الحفیظ

المرقوم ۲۹ ردسمبر ۱۹۸۳ء م ۲۵ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ

پروفیسر رفعت محترم پر مالک رام صاحب کا مضمون تذکرہ معاصرین جلد ۴ (مکتبہ جامعہ، نئی دہلی) سے لیا گیا ہے۔ مولوی احمد محمودیؒ کے متعلق معلومات کی فراہمی میں مضمون نگار کو بڑی محنت اور دشواری اٹھانی پڑی۔ اس کے باوجود واقعات کی کڑیوں کو سلیقہ سے جوڑنا انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کے لیے مصنفہ لائقِ مبارک باد ہیں ورنہ نگارِ وقت کے ہاتوں ان کی زندگی کے یہ نقوش بھی طاقِ نسیاں کی زینت بن جاتے! رہی خاکسار کے مضامین کی بات تو مزید وضاحت کے لیے اردو کے اعلیٰ ترین ادبی مجلہ "نقوش" (لاہور) کو زندہ جاوید بنانے والی قدر آور زندہ جاوید شخصیت محمد طفیل کے الفاظ میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ:۔

"شخصی مطالعے قربت اور دوری کی وجہ سے دھندلے اور روشن ہوتے ہیں۔ جتنی قربت ہوگی، اتنی ہی تصویر دھندلی بنے گی۔ جتنا فاصلہ ہوگا، اتنی ہی واضح تصویر بنے گی۔

یہ کلیہ ہر معاملے میں ساتھ نہیں دیتا۔ مگر پیشِ نظر کوئی شخصیت ہو تو (شاید) پھر یوں ہی ہوگا۔

یوں سوچیں کہ ایک قدآور شخصیت کے سامنے ایک بونا کھڑا ہے۔ وہ اگر کسی کو سر سے پیر تک جانچنا بھی چاہے گا تو کیسے جانچے گا؟ فاصلہ ضروری ہوا نا!

"میں ایک بونا ہوں!" ["جناب"۔ ادارہ فروغِ اردو۔ لاہور ۱۹۶۱ء]

کبھی فرصت ملے تو پچھلے پہر　　شب گزیدوں کی انجمن میں آ

سب مضامین پر بطور عنوان مصرعے یا اشعار خاکسار کے تجویز کردہ ہیں سوائے "جمالِ ہم نشیں۔۔۔۔" کے۔

سوائے خطوط کے سبھی مضامین کے مسوّدے مکمل تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے کمر ہمت باندھ لی اور اس کتاب کی اشاعت کے جملہ مصارف بلا شرکت غیرے ذاتی طور پر برداشت کئے۔ نہ ناموری کی ہوس ہے نہ شہرت کی تمنا! اللہ سے دُعا ہے کہ اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور ان تمام مرحومین کی ارواح کو تقربِ خاص کے ساتھ آسودۂ رحمت فرمائے۔ وہ ہم سے جُدا ہو گئے لیکن اس وسیلے سے ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جُدا نہ ہوں گے!

اُمید کہ عزیز و اقرباء، احباب و رفقاء، شاگردوں اور معتقدوں کے علاوہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

اس کتاب کی پیش کش کا مقصد ان شخصیتوں کے حالاتِ زندگی اور ان کے جلیل اور جمیل علمی کارناموں کو یادگار کے طور پر استفادہ کے لیے محفوظ کرنا ہے۔

بڑی کوتاہی ہوگی اگر میں ایک کرم فرما کے بے لوث مخلصانہ تعاون کا شکریہ ادا نہ کروں جن سے صرف ایک سال پہلے ملاقات ہوئی اور جان پہچان بڑھتے بڑھتے گہرے مراسم میں تبدیل ہوتی رہی۔ ان کا جیسا نام ہے طبیعت بھی ویسی ہی محبوب پائی ہے۔ نہ جانے ان کی مزاج شناسی

کے بعد انھیں کتنے لوگ محبوب رکھتے ہیں۔ ان کا اسم گرامی ہے الحاج محبوب علی خاں صاحب اخگرؔ قادری، جن کی اعانت نے کتابت اور طباعت کے سارے مراحل کو میرے لیے آسان بنادیا۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ محمد عبدالرؤف صاحب خوشنویس نے اس کتاب کو اپنی کتابت سے مزیّن کیا۔ جناب سلام خوشنویس صاحب نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے سرِورق کو آراستہ کیا۔ ان سب کا میری اور مرتب کی جانب سے شکریہ۔

ایک عرصے سے واقف کاروں کی نگاہیں منتظر تھیں۔ دل بے قرار اور دستِ شوق بے تاب تھے۔ ممکن ہے کہ ان کی یہ آرزو ہو کہ نگاہ اُٹھے اور "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" کا نظارہ ہو جائے! لیجیئے اس کے مطالعہ سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی اور دل و دماغ روشن کیجیئے۔

اب یہ "شمعِ فروزاں" علم و ادب کی انجمن میں ضو فشاں ہے۔ اس کی ضیاباری سے علم و آگہی کے چراغ روشن ہوں گے یا ان کی لو اور تیز ہوگی!

ہمارے بعد جب دُنیا میں افسانے بیاں ہوں گے
زمانہ ہم کو ڈھونڈے گا نہ جانے ہم کہاں ہوں گے

خواجہ معین الدین عزمی

۱۲-۲-۸۳۵/۱/۲
قریب آندھرا بینک مہدی پٹنم حیدرآباد
۵۰۰۰۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمالِ ہم نشین درمن اثر کرد

(مولوی جمیل الدین احمد)

ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی

مسوّدِ اوراق ہذا کے رضاعی خالو رحیم الدین مرحوم نے اپنی اردو پڑھادی تھی کہ فارسی شروع کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ چنانچہ خلیفہ عماد الدین مرحوم کی فارسی کی پہلی، دوسری اور شاید تیسری بھی ختم ہوئی تو "پیرایہ خرد" شروع ہوئی یہ نظم و نثر کا انتخابی مجموعہ ہے مرتب کا نام اب یاد نہیں رہا یہ اس زمانے میں درجہ ہفتم کا فارسی نصاب تھا، یہ بھی تمام ہوئی "نامۂ خسروان" نامی ایک کتاب نہ معلوم کدھر سے ہاتھ لگی، یہ کتاب میں نے اپنے طور پر شوق سے پڑھی۔ رضاعی والد کا انتقال ہوا اور میں اپنے حقیقی والدین کے ہاں آگیا اور مسجد میاں مشک کے مدرسہ دینیہ جانے لگا مدرسہ کے استاد ابوالفضل شرف الدین مرحوم "اخلاق محسنی" پڑھانے لگے اس میں دل نہیں لگا جوں توں یہ بھی پوری ہوئی تو انوار سہیلی کے درس شروع ہوئے اور اسی کے ساتھ "مراۃ الجمال" صائب کے کلام کا انتخاب عوام میں دیوانِ صائب!

ہاں یہ درج کرنا بھول گیا کہ میرے رضاعی والد غلام رسول خان تیر انداز تھے گھر پر آمد و رفت رکھنے والے لوگ وقت بے وقت کبیرداس کے دوھے اور پند نامہ سعدیؒ کریما کے اشعار سناتے رہتے تھے وہ یہ بھی کہتے رہتے کہ سعدیؒ نے گلستاں بارہ سال میں لکھی اور "کریما" چالیس دن میں (فسانہ ہی فسانہ ہے) صرف غلام رسول خان ہی نہیں بلکہ میں جس معاشرہ میں بار پاتا وہاں "چچا سعدی" "چچا سعدی" سنتا اور ان سے منسوب لطیفے سنتے رہتا تھا! سعدی کی گلستان! پڑھنے کی غیر معمولی خواہش اگر ابوالفضل شرف الدین ہوں یا کوئی اور جب گلستان کا نام لیتا تو یہی سنتا ارے میاں

گلستان کا دیباچہ بہت مشکل ہے۔ یا پھر بڑے ہو کر پڑھنا ابھی تمہاری عمر یہ کتاب پڑھنے کی نہیں ہے۔

ماہ و سال یاد نہیں کہ زندگی کا پہلا موڑ ــــ شعوری تبدیلی ایسی آئی کہ نہ گلستان نہ بوستان بلکہ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی اردو مڈل مڈل فسٹ میٹرک سے ہوتے ہوئے انٹرپاس کر لیا اور ہوتے ہوتے بی۔ اے ۱۹۳۴ء بی۔ اے میں عہد سلاجقہ سے کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ ایم۔ اے میں تاریخ اسلام لینے کا پختہ ارادہ ہو گیا۔ اُس زمانہ میں یہ مضمون اختیار کرنے کے لیے عربی ورنہ فارسی کی قابلیت لازمی تھی اور یہ قابلیت اس ناچیز میں ...... تاہم گلستان کا دیباچہ ــــ دیکھوں یہ کتنا دشوار ہے۔ اس زمانے میں سید نظام الدین مرحوم اپنے حقیقی خُسر حضرت سید محمود مکی مغفور کے بڑے مکان میں مقیم تھے۔ یہ حقیر فقیر سراپا تقصیر اس مکان کے بالاخانہ میں پڑا ہوا علم کی طلب میں سرگرداں رہتا تھا۔ سید مرحوم سے باتوں باتوں میں دیباچہ کا ذکر آیا تو کہا! اجی رائے جگناتھ پرشاد سیفی تو رہتے ہیں شوق سے پڑھائیں گے خاندانی کائستھ ہیں ان کی فارسی دانی مانی ہوئی ہے۔

گرمی کی چھٹیاں تھیں میں ایک صبح گلستان مطبع مصطفائی بغل میں دبائے ــــ رائے صاحب کے گھر پہونچا۔ قاضی پورہ سے اڑ کر چلیں تو محمد سبحان کی مسجد پانچ سات منٹ کا راستہ ہے اس مسجد کے سامنے بہت اونچی چوکی والا چھوٹا سا کویلو کا مکان ہے چھوٹا سا دیوان خانہ دریں سہ دری کے سامنے بیٹھ گیا پھر ایک نبرز نے اندر بلایا زنانہ حصہ سے آواز آئی آیئے جناب سہ دری کے بغل میں دریچہ سے مشابہ چھوٹا سا دروازہ جیسا گلبرگہ میں چاند بی بی کی مسجد کا داخلہ رکوع کیئے بغیر اندر داخلہ ناممکن راجہ صاحب لنگی باندھے نیم دراز ایک پاؤں کھڑا دوسرا اس پہ آڑا حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔!

بسم اللہ کے بعد پہلا جملہ منّت خدائے را عزّ و جلّ کہ طاعتش موجب قربت است! دوسرا جملہ شروع نہیں کیا تھا کہ فرمایا کہ قربت کے کیا معنی؟ میں نے جو کچھ کہا توجہ سے سُنا؟ پھر کہا آج پہلا دن ہے اِتنا کافی ہے غور کر کے کل آؤ۔

واپس ہوا راستہ تمام سوچتا رہا میں تو انوار سہیلی پڑھ چکا فردوسی و رومی بھی کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں یہ قربت چہ معنی دارد، دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے! دوسرے دن قربت پر تقریر ہوئی کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا، تیسرا دن جمعہ چھٹی ہفتہ کے روز گلستاں کے کچھ جملے خیال ہوا یا رہو نہ ہو دیباچہ کی شاید یہی شکل ہے کہ اس میں الفاظ کے ذریعہ معنی پر زیادہ سے زیادہ زور ہے تیسرے دن کے بعد گلستاں کا درس ہونا لگا اور جلال الدین جمیل احمد رائے جگناتھ پرشاد سے ملاقات پھر یکجائی انوار یا پیر کی شام درس شروع ہوا گلے خوشبوئے درحمام روزے الخ۔۔۔ چوتھا اور آخری مصرعہ تھا کہ راجہ صاحب خاموش! آنکھ اٹھائی دیکھا تو آنسو ٹپک رہے ہیں اور ضبط کی کوشش سے کچھ کپکپی سی ہے۔ احقر تھوڑی دیر خاموش رہا "حال" کے آداب سے واقف تھا دو تین بار یہی قطعہ دہراتے ہوئے چپکے سے باہر نکل آیا گھر آنے تک!

جمالِ ہم نشین در من اثر کرد ؎ وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم گنگناتا رہا۔ اسی شام سے مجھے تعجب آمیز تجسس شروع ہوا اور میں راجہ صاحب کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا راجہ صاحب کے والد کا نام رائے بھوانی پرشاد ان کے اجداد غالباً آصف جاہ ثانی ناصر جنگ شہید کے زمانہ میں کانپور سے حیدرآباد آئے کائستھوں کے گوڑ قبیلے سے تھے یہ سب اہلِ قلم تھے۔ غالباً اپنے والد یا چچا سے اس زمانے کی درسی کتابیں کریما، مقیما نام حق، انشاء مادھو رام، سکندر نامہ اور شاید خسرو نظامی بھی ۔۔۔۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ مرحوم نے ایک بار مجھ سے انشاء علی عادل شاہیہ کا ذکر کچھ اس طرح کیا گویا وہ بھی دکھن کے منشیوں کے نصاب میں شریک تھی۔ بھوانی پرشاد بعد تحصیل نصاب صرف خاص مبارک میں ملازم ہوگئے وہیں سے وظیفۂ حسنِ خدمت پاتے تھے مقدار غالباً بارہ روپے سے زائد نہیں تھی! فرزند دلبند کا درماہہ کئی سو ہوگیا تھا مگر دونوں صرفخاص مبارک کے بارہ روپیوں کو برکت کی وجہ اور خیر کا سبب جانتے تھے۔

بھوانی پرشاد مرحوم عنفوانِ شباب ہی میں لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان لا چکے تھے اور دست بندِ صلاۃ و پابندِ صوم تھے۔ غلام قادر نامی ایک

نقشبندی سہروردی بزرگ سے بیعت تھے! راقم الحروف نے ان کو ۱۹۳۴ء سے تا وفات ایک سی حالت پر پایا متوسط گندمی رنگ چھریرا جسم گھنی سفید داڑھی لبیں ترشی ہوئی! ناتی خاندانی تھا ہمیشہ تہمد اور تہمد کے اندر چڑی پاجامہ انگیہ سر پہ حیدرآبادی چندیا والی سوتی ٹوپی سفید جوتا ہمیشہ چرادیں بیٹھتے تو اکثر اکڑوں ہاتھوں سے احتباء کئے ہوئے گھر سے کم نکلتے تھے البتہ پاس پڑوس میں فاتحہ کے لیے بلائے جاتے تو جایا کرتے۔

جمعرات جمعہ لڑکیاں بوڑھیاں لال شکر یا حلیبی نکتیاں فاتحہ کے لیے لاتیں تو بیٹھے بیٹھے فاتحہ دیتے اور قدرے قلیل اسی وقت بچوں میں بانٹ دیتے تھے۔ بسلسلۃ البول کی شکایت تھی اس لیے نماز سہ دری ہی میں ادا کرتے زنانخانہ میں صرف ناشتہ کھانے کے لیے جاتے اور بعد عصر سہ دری کے سامنے والے چبوترے پر نواب مشرف جنگ مرحوم کے سنجھلے فرزند اور دوسرے تین چار بزرگ مغرب کی اذان تک بیٹھتے زیادہ تر آثار صحابہ یا بزرگان دین کا تذکرہ ہوتا۔ انہی سے سنا کہ شادی ہر چند کہ ویدک دھرم کے مطابق ہوئی تھی اور خلوت صحیحہ سے قبل اہلیہ خود تو تھیں ہی رسالت محمدی اور آخرت پر ایمان لے آئی تھیں آپ کی اولاد ذکور کتنی تھی میں نے دریافت نہیں کیا جس وقت راجہ صاحب پیدا ہوئے اس وقت آپ پنج وقتہ نماز اور شاید تہجد بھی ادا کرتے تھے اور بعد میں صلوٰۃ فجر یا اشراق تک ذکر سری شاید کبھی فاتحہ ہوا ہو۔ گھر میں دسہرے دیوالی کا کوئی اہتمام میرے دیکھنے میں نہیں آیا لیکن برادری کے آنے والوں کی پذیرائی پوری کچھوری یا مٹھائی سے ضرور ہوتی تھی بوڑھی دیرینہ خادم لکھما گھر کی منتظم سی تھی جن جن کا سالیانہ مقرر تھا وہ آتے سلام بجا لاتے اور انعام لیئے لوٹتے تھے مجرے گزارنے والیاں بھی محروم نہیں رہتی تھیں مالتی دلاری کو میں نے پہلی مرتبہ یہیں دیکھا تھا اس کے ساتھ عید الاضحیٰ اور عید الفطر پر کھانے کپڑے کا خصوصی انتظام بھی تھا! آپ کی اہلیہ کا انتقال کب ہوا یہ میں نے نہیں پوچھا البتہ ان کے زمانے کے معاشرتی حالات پوچھتا تو اکثر جواب مختصر ہی ہوتا تھا اس وقت یہاں صرف بطور نمونہ دو تین باتیں بر بنائے یاد عرض کرتا ہوں۔

نظام ہفتم افضل الدولہ مرحوم کی قوت و طاقت کے واقعات بیان ہو رہے تھے فرمایا! ربیع الاول کا ہفتہ تھا گیارہ تاریخ کی صبح مصاحبین سلام کے لیے حاضر ہوئے تو دیکھا حضور پرنور خلافِ توقع ایک یا دو بار جمائی لی۔ اللہ یار خان کے والد ان کا خطاب مجھے یاد نہیں آرہا ہے نے دست بستہ پوچھا مزاج دشمناں ؟ فرمایا! افضل الدولہ مرحوم اجبلان کو مسجد میں مولود ہو رہا تھا میں چھپرکھٹ پر تھا سرکار کا نام آیا اٹھ کر بیٹھ گیا پھر لیٹا، پھر سرکار کا نام آیا تو پھر اٹھ کر بیٹھا اذان سننے تک ایسا ہی ہوا اونگھتے بیٹھا تھا۔ بخار دیکر آکرا ٹھائی تو اٹھا! صرفِ خاص مبارک میں تقریباً ہر ماہ کوئی نہ کوئی نیاز ہوتی رہتی تھی حصے بٹتے، بکرے تقسیم ہوتے اور خاص دلوڑھی مبارک میں دسترخوان بھی ہوتا ہر نیاز کا پکوان بھی مخصوص ہوتا تھا کسی نیاز میں پلاؤ کسی میں کھچڑی کسی میں قبولی کسی میں حلیم کسی میں قورمہ روٹی کسی میں نان حلوہ ایک نیاز میں دودھ دلیا وقس علیٰ ھذا دسترخوان ہوتا حضور بذاتِ خود علماء و مشائخ کا ہاتھ دھلاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور (افضل الدولہ مرحوم) ہاتھ دھلا رہے تھے شاگرد پیشہ سلابچی تھامے ہوئے تھا سرکار کے ہاتھ میں آفتابہ تھا۔ ایک مرتعش بزرگ نے اس طرح ہاتھ دھویا کہ آفتابہ خالی ہوگیا دوسرے بزرگ آگے بڑھے شاگرد پیشہ پانی بھرا آفتابہ دینے نہ پایا تھا کہ سرکار نے آگے بڑھ کر پانی بھرا تیرٹا اٹھالیا اور ہاتھ دھلانے میں مصروف ہوگئے خبر محل میں پہونچی تو ظہر کی اذان سے پہلے ہی کئی بکرے صدقے میں اُترے اور نظر اتارا ہوگیا! راجے صاحب یہ بھی سنی سنائی روایت کرتے تھے کہ افضل الدولہ مرحوم اپنے ایک شریف و نجیب و پرہیزگار مصاحب سے تذکرۂ اولیاءؒ سنا کرتے تھے۔ اس روایت کی توثیق راقم السطور کو ایک اور طرح سے یوں ہوئی کہ سرکار اپنی نجی محفل میں بعد تلاوت تنزیل العزیز الرحیم "پیرانِ پیرؒ" کی "فتوح الغیب" کی شرح عبدالحق بھی سنا کرتے تھے! واللہ اعلم۔

بھوانی پرشاد مرحوم سے خالص دینی معلومات حاصل کرنے کا شوق کہیئے یا اشتیاقِ تجسس میرے لیے شاید طبعی تھا چنانچہ سلوک کے بارے میں کئی بار پوچھا اکثر تو یہی جواب ملا قرآن بس ہے۔ اللہ کافی ہے اور کئی سوالوں کے جواب میں قدرت ہے قادر کی سمجھ کر خیال ہوتا تھا یہ تو سالکانہ نہیں مجذوبانہ جواب ہے

مثلاً میں نے پوچھا مسلم بے نمازی کیوں ہو گئے؟ تو فرمایا "قدرت قادر کی" میری مالی مشکل کس طرح دُور ہو؟ "قدرت قادر کی" ایسے جوابوں سے میری ہمت ٹوٹ گئی البتہ سال ڈیڑھ سال بعد جب میں شیخ محمد حسین مرحوم ناظم دینیات سے بیعت ہو گیا ایک روز بعد عشاء فرمایا! نماز تو ہو رہی ہے کچھ اور بھی ہو رہا ہے عرض کی رات کو اٹھ نہیں سکتا دیر تک کالج کا نصاب پڑھتا رہتا ہوں صبح ایک یا چند آیتیں قرآن کی اور دو چار حدیثیں مجموعوں میں سے کسی ایک مثلاً صحیح مسلم کے دو تین صفحے یہ سن کر صرف اتنا ہی فرمایا ٹھیک ہے "قدرت ہے قادر کی"۔

احقر العباد کو رستہ پر ڈال دیا گیا تھا تجربہ کار راہ روؤں کی باتیں کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھیں ایک روز دو زانو بیٹھ گیا اور فاسد یہ نصیبوا کا ذکر شروع کر دیا مجھے غور سے دیکھا میں نے سر جھکا لیا ذکر خفی جاری رکھتے ہوئے ہمت صرف کرنے لگا فرمایا "قدرت ہے قادر کی" بولنا آسان کرنا مشکل رستہ چلتے رہنا ہی منزل ہے ہمارے حضرت نے جو کچھ بتایا وہ تو صرف چند فقرے ہیں:۔

ہوش در دم' نظر بر قدم' سفر در وطن' خلوت در انجمن۔

یادگیر۔ بازگشت۔ نگاہ داشت۔ یادداشت۔ پھر خاموش سکوت محض! نظر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں آنکھیں سُرخ انگارا داڑھی کے بال کھڑے ہوتے اور ادھر اپنے دل میں گرمی دل میں کیا سارا بدن گرم معلوم نہیں کتنی دیر وہاں بیٹھا بہرحال افاقہ ہوا۔

اس واقعہ یا حادثہ کے کئی دن بعد تلقین شدہ جملوں کی کچھ تشریح چاہی تو فرمایا کیا ابھی گلستان ختم نہیں ہوئی میں خاموش ہو رہا تو فرمایا شام بعد مغرب آو! وقت مقررہ پر حاضر ہوا ایک جملے کی تشریح فرمائی عشاء کی اذان تک تفہیم جاری رہی۔ تین دن یہی عمل رہا تیسرے روز فرمایا اب مزید طلب بیکار ہے "قدرت ہے قادر کی" آگے تمہارے نصیب والسلام! اللّٰھم اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝

رائے بھوانی پرشاد نے نام کیوں نہیں بدلا؟ یہ سوال ایک سے زاید

مسلموں نے کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نام بدلے جن سے شرک باللہ ظاہر ہوتا تھا عبدالکعبہ، عبدالیل، عبدمنات یہ مشرکانہ نام تھے آپؐ نے وہ نام ناپسند فرمائے جو معنًا ناگوار تھے شہاب (انگارا) عاصیہ (گناہ کرنے والی) آپؐ نے شہاب کو ھشام اور عاصیہ کو جمیلہ سے بدل دیا، تحقیق چاہیئے تو دیکھئے: صحیح مسلم الآداب باب (۱۴)۔ سنن ابی داوٗد الادب باب/۶۲۔ سنن ترمذی الادب باب/۶۲ الپ ارسلان، شیرشاہ سوری، جمشید قلی عربی نام نہیں ہیں اور معنی کچھ خوشگوار بھی نہیں ہندوستان میں عبدالنبی، علاالدرسول .... اسلامی نام سمجھے جاتے ہیں درآں حالیکہ ان میں شرک کا پرتو نمایاں ہے مسلم علماء فرض، واجب، سنت و مستحب کا فرق عام نہیں کرتے لیکن الحمدللہ احباء احسانِ مسلسل ع گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی!

کا بقدر استطاعت حیات بخش پیام پہنچاتے رہے ہیں! بھوانی پرشاد معنًا غالبًا یزبخش کا مترادف ہے اور جگنا تھ پرشاد کے معنی غالبًا عطیہ خداوندی ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں ہندی زبانوں کے غیرمشرکانہ نام بھی عوام کے نزدیک غیراسلامی سمجھے جاتے ہیں۔ رفع اشتباہ کے لیے ناموں میں اظہار توحید قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے چنانچہ اپنے پوتے پوتیوں کی شادی کے موقع پر بلکہ اس سے پہلے ہی سابقہ نام عربی ناموں میں بدل دیئے گئے! رائے بھوانی پرشاد مرحوم کے متعلق جو سوالات پوچھے گئے! ان کے فرزند دلبند رائے جگنا تھ پرشاد (راجہ صاحب یا رائے صاحب) کے متعلق بھی مزید کئی سوالات پوچھے جاتے ہیں! بعض سوال تو خواہ اہم یا زیادہ اہم نہ ہوں تاہم باوجود علم واِطلاع ان کے جوابات نہ دینا اخلاق سے بعید شاید نہوں مروت سے تو دور ہی معلوم ہوتے ہیں! لہٰذا عرض ہے!:-

رائے جگنا تھ پرشاد عرف جلال الدین جمیل احمد کو مَیں اور میرے سسرالی جملہ افراد خاندان ان کی زندگی میں چچا اور بعد وفات راجہ حضرت پکارتے تھے آئندہ سطروں میں ان کے حالات اِسی عرفی نسبت سے عرض کروں گا۔

راجہ حضرت کی پہلی زوجہ کا حال مجھے معلوم نہیں مرحومہ کے بطن سے

تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں پہلی لڑکی کا انتقال ہوگیا، ایک لڑکی اور تین لڑکے زندہ سلامت ہیں سب کے سب ماشاء اللہ صاحب اولاد دین دار و فارغ البال ہیں۔ دوسری شادی کا ماہ و سال میں نے دریافت نہیں کیا البتہ یہ بات یقینی ہے کہ عقد ازدواج اسلامی شرع کے مطابق ہوا نکاح کے گواہوں میں غالباً سید نظام الدین مرحوم پسرِ سید زین العابدین مغفور جیسے بزرگوار بھی تھے محل ثانی سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں یہ بھی سب نیک نہاد و دین دار ہیں! راجہ حضرت کی ابتدائی رسمی تعلیم اپنے والد ہی سے ہوئی پھر مدرسہ منصبداران میں شریک ہوئے یہ مدرسہ شاہی حویلی (منجھلی بیگم کی حویلی) کے اس حصّہ میں تھا جس کے روبرو شاہ جھاڑو مستان کی قبر اور اس سے متصل چھوٹی سی مسجد ہے پہلا امتحان رُشدیہ کا تھا جو موجودہ جماعت ہفتم کے مساوی ہے بعد ازاں مولوی پھر مولوی عالم درجہ اول میں کامیاب کیا امیدواروں میں سب سے زیادہ نشان حاصل ہونے پر عماد الملک طلائی تمغے کے مستحق ہوئے سند راقم الحروف نے دیکھی تھی اس میں تمغہ کا حوالہ بھی تھا! مولوی عالم کے بعد ملازمت اختیار کی آصفی فرمانرواں سے اخلاص و مودّت کا تعلق پشتینی تھا ملازمت وہیں کی اورنگ آباد میں بھی رہے معاشی و عائلی تند حصنوں نے انگریزی کی طرف توجہ کرنے نہ دیا۔ مدرسہ منصبداران کے اساتذہ سے ایک استاد سید موسیٰ کا ذکر راجہ حضرت بڑے ادب و محبت سے کرتے تھے من جملہ اور کتابوں کے شرح مسلم ملا حمد اللہ و قاضی مبارک اور تمام کلام میں شرح عقائد نسفی کا خصوصی مطالعہ کیا تھا عبدالقدیر صدیقی مرحوم صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ سے تفسیر پڑھی تھی۔ حضرت عبدالقدیر مرحوم رکاب گنج میں رہتے تھے اس وقت گھر پر صحیح بخاری کا درس ہوتا تھا۔ اس درس میں منتہی طلبا شریک ہوتے تھے جن میں راجہ صاحب بھی تھے بعد میں جب آپ رکاب گنج سے ملک پیٹھ میں اپنی کوٹھی میں منتقل ہوئے تو وہاں از سرِ نو سنن ابوداؤد کا درس ہونے لگا۔ راجہ حضرت کے ساتھ یہ ناچیز بھی بحیثیت مبتدی کئی بار شریکِ مجلس رہا ہے۔ اس درس کی وسعت و گہرائی کا اندازہ کراچی کے

عالموں کو اس وقت ہوا جب راجہ حضرت کے ہم درس و ہم دم سید قطب الدین محمودی مرحوم نے اپنے دار ہجرت میں دکھنی عالموں کا ورثہ تقسیم کرنا شروع فرمایا۔

حضرت راجہ کو اخبار بینی کا شوق نہیں تھا لیکن پہلی جنگ کے دوران الہلال والبلاغ لازماً دیکھا کرتے تھے۔ میری ادبی آوارہ خواتی کا حال معلوم ہوا تو ایک بار پوچھا "سلطان القلم" کی تحریر دیکھی ہے؟ "سلطان القلم" کی ترکیب میرے لیے نئی تھی تاہم تاڑ گیا اور بے صبری سے "ترجمان القرآن" کا ذکر کیا تو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا جامعہ سے مستعار لی اور دکھائی! کئی روز بعد رائے دریافت کی تو فرمایا "ترجمانی فی الجملہ خوب ہے قرآن فہمی کے لیے عقل کی اہمیت نمایاں کرنا بھی بے جا نہیں! مگر نہ معلوم آیا ک نستعین کی تفسیر کیوں نہیں کی۔ احسان نظر انداز کرنا تو قطعاً نادرست! کسی اسیر آزاد نے معذرت پیش کی تفسیر صرف ۲۳ سورتوں کی ہے تفسیر احسان شاید آگے آئے۔ حضرت راجہ نے یہ معذرت قبول نہیں کی۔

ترجمان القرآن کی پہلی اشاعت غالباً ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی اس وقت سے اب تک قرآن کے اکثر طالب علموں کی یہی رائے ہے جو حضرت راجہ نے دی تھی۔!

"ترجمان القرآن" کے لفظ سے ان اوراق پر نظر ڈالنے والوں میں سے کسی کا ذہن "رسالہ ترجمان القرآن" کی طرف منتقل ہو تو کوئی تعجب نہیں!

جب کبھی بلدہ میں رہتے تو سعید جنگ مرحوم یا غلام محمود قریشی قریباً روزانہ ہی آپ کے شیخ محمد حسین فاروقیؒ کے یہاں آیا کرتے تھے ان کے ساتھ بعض وقت ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم بھی ہوتے اور بقدر استعداد حضرت سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ خواہ مستقر پر ہوں خواہ بلدہ میں "مودودی" مرحوم کے مضامین شوق سے ملاحظہ کرتے اور جب ملاقات ہوتی تحسین سے ہمت افزائی فرماتے تھے۔ حضرت راجہ آپ

ہی کے فرمانے سے "رسالہ ترجمان القرآن" کے خریدار ہوئے ایک مرتبہ چندہ میں تاخیر ہوگئی تو بذاتِ خود میرے ساتھ ترجمان القرآن کے دفتر واقع بدر الدین بلڈنگ سدی عنبر بازار جاکر چندہ دیا۔

حضرت راجہ اپنے گھر کے سامنے والی مسجد میں بعد فجر مطالعہ قرآن یا درس قرآن و تفسیر کی ابتداء کب کی یہ مجھے یاد نہیں رہا غالباً ۱۹۳۵ء سے یہ سلسلہ ہوتا رہا حضرت راجہ جلالین و مدارک کو ناکافی سمجھتے تھے کشافِ زمخشری کے ساتھ روح البیان اسماعیل حقی کبھی کبھار ہی دیکھا کرتے تھے درس و مطالعہ کے لیے ہمیشہ ہی تبصیر الرحمان پیشِ نظر رہتی تھی۔ [یہ علاء الدین بن محمد مہائمی متوفی ۸۳۵ھ کی تفسیر ہے۔ الحمد للہ سے والناس تک معنوی حیثیت سے توحید خالص ہی جاری وساری رہتی ہے]۔

راجہ حضرت نے ابتدائی ملازمت کے دوران وکالت کا امتحان بھی دیا تھا جس وقت آپ کے ہاں میری رسائی ہوئی اس وقت صرفخاص کے محکمہ عدلیہ سے وابستہ تھے منصفی کی کچہری ترپ بازار میں ہندوستانی گلی کے جنوبی سرے پر تھی بعد میں پورا دفتر مبارک محل میں آگیا وظیفہ حسن خدمت تک آپ کا اجلاس اسی محل کی دوسری منزل پر ہوتا تھا صرفخاص کے محکمہ عدالت کا انتظامی اور مالی دونوں کا تعلق حضور پُرنور سے تھا البتہ بربنائے عمل درآمد فرمان سرکار عدالت العالیہ سے مشورہ ہوتا تھا اور منصفی یا نظامت کا مرافعہ عدالت العالیہ میں ہوسکتا تھا اور کبھی کبھار ہوتا بھی تھا۔ راجہ حضرت کا یہ کارنامہ یقیناً قابلِ ذکر ہے کہ پورے دوران ملازمت آپ کے فیصلوں کے صرف پانچ یا چھ مرافعے ہوئے اور ان میں بھی تین میں آپ کا فیصلہ ہی بحال رہا۔ شاید اسی لیے صرفخاص اور عدالت العالیہ دونوں محکموں میں آپ کی دیانت، قانون کی حفاظت اور بے لاگ منصفی ضرب المثل سی تھی حتیٰ کہ فریقین کے وکلا بھی کمرہ عدالت سے باہر نجی گفتگو میں راجہ حضرت کی تعریف کرتے تو عام لوگ تعجب کرتے تھے جو لوگ راجہ صاحب کے والد سے واقف نہیں تھے وہ تو یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ خدا کرے ہمارا سارا محکمہ عدلیہ ایسے

نومسلموں سے پُر ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو! دوسرے صاحب فقرہ جڑتے یہ تو وقتی جوش ہے دیکھو چند نسلوں کے بعد کیا ہوتا ہے!

"چند" کا حال تو خدا جانے مگر اب بھی مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے سب فرزند ماشاءاللہ کپوت نہیں پوت بلکہ سپوت ہیں اللھم زد فزد۔

راجہ حضرت کی اہلی زندگی:- میر حسین علی پسر عابد یار جنگ مہتمم مکہ مسجد کی دختر سید نظام الدین مرحوم کی اہلیہ محترمہ اور ان کی دختر! ان تینوں سے سنا کہ "راجہ چچا" اپنا بیشتر وقت تو مردانہ حصہ میں گزارتے تھے اور جب کسی ضرورت سے زنانہ حصہ میں داخل ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا گرمی کے موسم میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آگیا۔ اہلیہ محترمہ سے کبھی اپنے شوہر کی شکایت نہیں سنی گئی۔ راجہ حضرت اپنا درماہہ زنانہ حصہ میں جانے سے قبل اپنے والد کو نذر کر دیتے تھے اور وہ اپنی بہو کے سپرد کر دیتے! رہا اپنے بچوں سے سلوک سو وہ سب بفضلہ زندہ ہیں وہ مجھ سے بہتر طور پر بیان کر سکیں گے یہ لوگ لگی لپٹی بات کرنے والے نہیں ہیں مجھے تو راجہ حضرت "خیرکم خیرکم لاھلہ" (ترمذی مناقب/۶۳) کے مصداق معلوم ہوئے واللہ اعلم واحکم۔

راجہ حضرت کے حالات معلوم کرنے والوں کو یہ جاننے کی تو زیادہ خواہش نہ ہوگی کہ وہ ٹھنگنے سے سانولے رنگ کے تھے زندگی کی شاید پچاس بہاریں بھی نہیں دیکھی تھیں دانت جھڑ گئے تھے اس لیے غذا چوکے سے چباتے اور لکھتے پڑھتے عینک کی مدد سے تھے۔ خونی بواسیر خدا جانے کب سے "پیچھے پڑ گئی تھی" خدا بھلا کرے معشوق حسین خاں مرحوم کا کہ ان کے اصرار سے عمل جراحی ہوا اور اللہ نے شفاء دی۔ یہ بات بھی بتانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ راجہ حضرت کو بھونا ہوا گوشت اور بریانی بہت پسند تھی اور یہ کہ خود کھانے سے کہیں زیادہ کھلانے کا شوق تھا خواہ وہ شوربہ روٹی ہو کہ محض دال خشکہ ایسی عام باتوں سے قطع نظر بعض لوگوں کو راجہ حضرت کے ایسے حالات معلوم کرنے سے دلچسپی ہوگی جن سے ان کے اخلاق و کردار کا ایسا وصف نمایاں ہو جو دوسروں کے لیے باعث نصیحت ہو اس خصوص

میں راقم السطور صرف اتنا کہہ سکتا ہے ان کی زندگی کے ایسے واقعات ثبت کر دے جن سے کسی نہ کسی حد تک مذکورہ مراد پوری ہو سکے۔

نقل مطابق اصل کی ذمہ داری لینا دشوار ہے۔ بِعَینہٖ روداد تو کاتبین کرام محفوظ کر رہے ہیں اس لیے میں وہی واقعات بیان کر وں گا جو مجھے ذکر کے قابل معلوم ہوں اور جن کا میں عینی شاہد ہوں یا انھیں ایسے راوی سے سُنا ہے جو میرے نزدیک معتمد ہو۔ ان واقعات میں تاریخی یا موضوعی ترتیب بھی نہیں ہوگی ان کی حیثیت گویا مختلف موقعوں پر لی ہوسادہ تصویریں ہیں جو ایک نوسیکھ اناڑی نقاش نے وقت بے وقت لے لی تھیں۔

یہ نیم نمازی گلستان میں جوں جوں آگے بڑھتا گیا نماز کی دست بندی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جاڑے میں کسلمندی نے اُٹھنے نہیں دیا۔ پوچھا گیا جناب کہیں یہ کہنے کی نوبت نہ آئے۔ لڑکپن کھیل کر کھویا، جوانی نیند بھر سویا، بڑھاپا دیکھ کر رویا۔ کہیں سے آواز آئی "نبی جی آسرا تیرا!" خیر گرم پانی نہ ملنے کا عذر تراشنا کیا مشکل تھا دو تین دن بعد کچہری سے لوٹتے ہوئے عثمانیہ بازار کی کمان پر بگھی ٹھیرائی مجھے ساتھ لیے اندر چلے اور ایک اسٹو دلایا۔ میں نے پس و پیش کی تو کہا اچھا ادھار سمجھو جب اللہ وسعت دے مجھے یا کسی اور کو دے دینا گرم پانی سے وضو کبھی ہوا کبھی نہیں ہوا البتہ اسٹو پر چائے بنتی رہی۔

ایم۔ اے سال اول کا امتحان آگیا بالواسطہ معلوم ہوا کہ ابو النصر صاحب کے پاس امتحان کی اُجرت نہیں سخت فکر مند ہیں کتابیں اتنی نہیں کہ بیچ کر پچیس روپیہ اکٹھا کر سکیں رقم داخل کرنے میں ابھی پانچ چھ روز باقی تھے ایک صبح نو دس بجے مجھے ساتھ لے کر نصیر یار جنگ مرحوم کی ڈیوڑھی گئے! جنگ ادب سے ملے! بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راجہ حضرت کی سفارش یا تعارف پر حاجت مندوں کی مدد کیا کرتے تھے دولت سرا میں جو نقد و جنس ہوگا اس کا علم تو اللہ کو ہے حدود بلدہ سے لگی ہوئی زمین کی قیمت ۱۹۳۵ء میں کئی لاکھ تھی! راجہ حضرت نے کہا یہ طالب علم بی۔ اے کر چکا ہے اب ایم۔ اے میں پڑھ رہا ہے،

ہونہار ہے امتحان کی فیس پچیس روپے ہے۔ جنگ چپ چاپ سنتے رہے پھر کہا اب نہیں ہو سکتا، راجہ حضرت نے دوبارہ کچھ کہا جو میں سن نہ سکا جنگ نے جھڑک کر کہا اب نہیں ہو سکتا ہا!

مجھے تو غیرت و غصہ دونوں، راجہ حضرت بھی منہ لٹکائے کچھ کہے سنے بغیر اپنے گھر لوٹے۔ میں نے تو جو کچھ کتابیں اپنی تھیں اسے چوک تپانے کا ارادہ کر ہی لیا۔ رات میں کوئی دس بجے کا عمل ہوگا کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا میں تو کھپریل والے بالا خانے پر کروٹ بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد "ابو النصر صاحب ابو النصر صاحب!" نیچے اترا تو "سید مغفور" نے کہا۔ یہ لو راجے صاحب آئے تھے یہ تمہاری فیس دے گئے ہیں۔ اس زمانے میں نوٹوں کا چلن ذرا کم تھا۔ اوپر آکر گنا تو پورے پچیس ۲۵۔ یم۔ اے پاس!

ام۔ اے آخری میں شرکت کی فیس ؛ راجہ حضرت نے اپنے ایک معتمد دوست نواب دوست محمد خاں جمعدار سے غالباً پہلے ہی میرے لیے کچھ کہہ رکھا تھا۔ داخلے کا وقت آیا تو مجھے مسلم لاج لے گئے اور نواب جمعدار سے تعارف ہوا انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ ایم۔ اے کے بجائے ال۔ ال۔ بی پڑھتے کو اچھا تھا اب بھی موقع ہے یم۔ اے ہو گئے تو مدرسی کہیں نہیں گئی۔ ال۔ ال بی کر گئے تو ڈھیر دل کما وگے اور ساتھ ساتھ قوم کی خدمت بھی ہو سکے گی۔ پھر راجہ حضرت سے مخاطب ہو کر فرمایا انھیں کل صبح بھیج دیجئے۔ دوسرے دن مسلم لاج پہنچا تو نواب مرحوم کے داروغہ نے مجھے کچھ رقم دی مقدار اس وقت بالکل یاد نہیں آرہی ہے بہر حال امتحان ایم اے آخری میں شرکت ہوئی اور یہ رقم کام آئی۔ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن معلوم نہیں کیا بات تھی طبیعت پر سخت گرانی تھی! مصلی چار پانچ ہی ہوتے اور پیش امام موجود نہ ہوتا تو راجہ حضرت مجھے آگے بڑھا دیتے تھے! بعد عصر مجھے افسردہ دیکھا تو پوچھا کیوں کیا بات ہے اصرار سے پوچھا تب بھی کچھ بتا نہ سکا راجہ حضرت لیکا یک بیٹھ گئے میں بھی بیٹھ گیا تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا جس نے جو

کچھ احسان کیا ہے اس کا بدلہ کرنے کی نیت پختہ ہونا چاہیئے۔ قرض تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لیا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ یکا یک دل کی گرانی دور ہوگئی بلکہ انبساط محسوس ہوا۔ ایم اے آخری میں نظام الملک طوسی کے سیاسی خیالات پر مقالہ لکھنا تھا۔ سیاست نامہ ایران نیا چھپا تھا کتاب منگوانے کی خواہش ہی کی تھی کہ کتاب بمبئی سے اپنے نام منگوا کر میرے حوالہ کی۔

حضرت راجہ صاحب کے ایسے ہی مالی تعاون کا حساب رکھا تھا مدتوں بعد جبکہ آپکی وفات ہوچکی تھی، آپ کے تیسرے فرزند بھاول پور سے آئے ہوئے تھے رقمی ضرورت پیش آئی تو اپنے دوست محمد جہانگیر سے اس کا ذکر کیا اور انھوں نے مجھ سے (اس وقت ہاتھ کشادہ تھا) جملہ رقم صغوۃ الرحمٰن مرحوم کی وساطت سے عبدالرحیم سلمہ کے حوالہ کردی اور وہ پرانی بعد عصر والی بات کی یاد تازہ ہوگئی۔

بطور تحدیث نعمت ایک جملہ لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ "نواب جمعدار" اور دوسروں نے جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ نے اس کا قلبی، لسانی و عملی شکر بجالانے کی بھی توفیق عنایت فرمائی۔ وھو الرزاق الرحیم وانہ ھو الغنی الحکیم۔

میر بہادر علی جوہر پسر میر لیاقت علی سیف مرحوم ایک عارضی دفتر میں ملازم تھے محکمہ برخاست ہوا اور مناسب روزگار نہ مل سکا تو آبرو بچانا دشوار معلوم ہوا۔ راجہ حضرت کو معلوم ہوا تو فوراً اپنی کچہری میں ان کو نقل نویسوں کے زمرہ میں شامل کردیا۔ اپنی ترقی کی جگہ خالی ہوئی تھی جوہر صاحب کو قابل پایا اور تقرر کردیا محکمہ مال گزاری کے ایک سید زادہ مخدوم زادہ فقر منش عہدہ دار نے نظام آباد میں بلا اجازت سرکاری جنگل کاٹ لینے والے مستاجر کو گرفتار کیا۔ اس مستاجر نے صدر المہام پیشی کو نذرانہ گزرانا اور پیرزادہ معطل نہ برطرفی نہ بحالی حضرت راجہ

اس سید زادہ کے گہرے دوست اور تو کچھ نہ کر سکے ایک ذی حیثیت وکیل کا مددگار بنا دیا سید زادہ کی غیرت، حضرت راجہ کی دعا چار چھ ماہ کے اندر اندر اللہ نے اس کو کاروبار کی راہ بتائی کام چل نکلا اور چند سال میں مرفہ الحال نہ سہی فارغ البال تو ہو ہی گئے۔

دانتوں کی زحمت کے دوران ایک دوست کے اصرار سے بنگال کا بنا ہوا ادم کا چولھا خریدا تلے اوپر آگ سے خشکہ شوربا پک جاتا تھا چند ہفتے ہوئے تھے سیّد زادہ کی بہو آئی ہوئی تھی اس نے یہ چولھا دیکھا بہت پسند کیا۔ سیّد کی بہو ادھر اپنے گھر گئی ادھر مجھے حکم ہوا "یہ چولھا ان کے گھر پہونچا دو"۔ مجھے تعمیلِ ارشاد میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔

دفتروں میں صادر تقسیم ہوتا ہے اس میں فونٹن پن کا اضافہ نیا نیا تھا اور پارکر بھی نیا۔ ایک روز حسبِ عادت گھوڑی توڑے کے ساتھ قلم لگائے نکلے۔ مرحوم بیٹی کے شوہر نے دیکھا پھر ہاتھ میں لے کر کچھ اس طرح الٹ پلٹ کیا کہ خسر صاحب نے سابقہ داماد کو دفتر والا قلم اسی وقت دے دیا اور خود دوسرا مول لیا۔

راجہ حضرت کبھی کبھار سنیما بھی دیکھ لیا کرتے تھے ایک مرتبہ "احکام عشرہ" کا ذکر کیا اور تحسین کی کئی ماہ بعد بن حر کا اشتہار دیکھا اور دیکھنے کی خواہش کی چنانچہ ہم دونوں بن حر ایک ساتھ دیکھے، گلزار حوض سے گھر آنے تک سیدنا عیسیٰؑ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ راجہ صاحب کو فنونِ لطیفہ میں موسیقی سے خصوصی دل چسپی تھی۔ قوالی سنتے اور سر دھنتے تھے اس کے سوا بھی کوئی محفل شائستہ و پاکیزہ ہوتی اور بلائے جاتے تو اس میں اہتمام سے شرکت کرتے تھے۔

ایک بار بڑی شنکری کے پاس سے دعوت آئی تقریب مجھے یاد نہیں رہی غالباً وہ اپنے کسی شاگرد کو اپنے فن کے عام اظہار کی اجازت دینے والی تھی یہ اس زمانے میں ترپ بازار کے جنوبی چوراہے کے ترپولیا کے

عقب میں رہتی تھی۔ محفل میں ہم دونوں نو بجے صبح پہونچے وہاں قریباً ساٹھ ستر اور تھے بیشتر کمسن سال۔ جب ہم پہنچے بڑی شنکری سروقد اٹھ کر تعظیم بجالائی خود ستار لیا اور کم وبیش آدھ گھنٹہ تک پوری محفل گویا صوت سرمدی میں گم سُم رہی کچھ ایسا معلوم ہوا کہ ہم سب اِس دُنیا میں نہیں ہیں۔ شنکری کے بعد دو تین اور لڑکیوں نے اپنی مشق ومہارت کا مظاہرہ کیا بارہ کے بعد ہم رخصت ہونے لگے تو شنکری نے گلاب پاشی کی اور اس کے دونوں جانب استادہ نوچیوں میں سے ایک نے لڈو پیش کیے اور دوسرے نے پھول سونگھنی دی اور تینوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر راجہ حضرت کو سلام کیا طفیلی کی قسمت میں کسی کی صرف ایک طرح دارانہ نظر ہی لکھی تھی۔

ایک مرتبہ سید زادہ کے بالاخانہ پر جوہر خسروؔ نے محفل برپا کی۔ ؎

شمع رو آپ گو ہوئے لیکن
لطف سوز وگداز کیا جانیں

پر راجہ حضرت نے خوب داد دی "جوہر خرد" نے صفیؔ مرحوم سے استفادہ براہِ راست نہیں کیا تھا .... کا اندیشہ نہیں تھا اس لیے زیادہ تر ان ہی کی غزلیں سناتے الاپتے تھے اس محفل میں انھوں نے یہی کہا۔ راجہ حضرت یوں تو کئی شعروں پر جھومے سر دُھنتے مگر جس شعر پر لوٹ پوٹ ہوئے صرف وہی یہاں نقل کرنا مناسب ہے۔ ؎

تھے وہ جلوے میری آنکھوں میں کہ اللہ اللہ
نُور ہی نُور کی برسات تھی اندر باہر!

راجہ صاحب کلام صفیؔ کے اتنے مداح تھے کہ اپنی خوشنودی کا بار بار اظہار کرتے تھے۔ سید صلاح الدین شطاری راجہ حضرت کے ہمسایہ اور شاید ہم درس بھی رہے تھے ان کے بڑے لڑکے سید عبدالباقی شطاری سے صفیؔ مرحوم کی پُرانی دوستی تھی اور وہ راجہ حضرت کے ارادتمند تھے راجہ حضرت کی

صفی مرحوم سے راست ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے آپ نے مولوی عبدالباقی شطاری سے کلام صفی کی فرمائش کی ان کی درخواست پر صفی مرحوم نے قریباً دس غزلوں کا خود ہی انتخاب کیا اور اپنے ہاتھ سے نقل کر کے مولوی عبدالباقی شطاری کے حوالہ کیا اس ذریعہ سے یہ راجہ حضرت تک پہنچا ایک بار کتابوں میں رکھے ہوئے چند اوراق نکلے تو انہماک سے دیکھنے لگے۔ راقم الحروف نے صفی مرحوم سے اپنا تعلق ظاہر کیا تو ایک بار بعد عشاء میرے ساتھ صفی مرحوم کے گھر پہنچے اور انہی کی زبان سے متعدد شعر سُنے اور تحسین کی۔ جو لوگ راجہ حضرت کو دوست رکھتے اور ان کے ارادتمند تھے ان کی تعداد سیکڑوں میں تھی جن لوگوں کو خود راجہ حضرت عزیز رکھتے تھے ان کی تعداد میرے دوران نیاز میں پانچ سات سے زیادہ نہ تھی یہ ایسے دوست تھے جن سے وہ کم از کم مہینے میں ایک بار ملاقات کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

نواب مشرف جنگ مرحوم اور راجہ حضرت کا خاندان ہم محلہ بلکہ ہم سایہ تھا راجہ حضرت کو معاشی ترقی کی راہ پر ڈالنے والے مشرف جنگ مرحوم فرزند نواب عزیز یار جنگ مرحوم تھے۔ عید، بقرعید کے علاوہ بھی راجہ حضرت نواب مرحوم کے ہاں جاتے تو ادب سے بیٹھتے تھے۔ اس ناچیز کو نواب مرحوم سے ادبی استفادہ کا موقع اسی ذریعہ سے ملا۔

نصیح جنگ کی مسجد کے دروازے پر مستقل ایک موٹے ڈانڈ گے سیاہ فام بزرگ کھری چارپائی پر بیٹھے یا لیٹے رہتے تھے۔ لوگ انھیں حاجی اسمٰعیل صاحب کہتے تھے غالباً نظام آباد کے رہنے والے تھے بظاہر تو ناخواندہ معلوم ہوتے تھے مگر تھے نہایت ذکی الطبع کسی شخص کی تلوے کی لکیریں دیکھ کر اس کے عادات واطوار و کردار کی نشاندہی کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ مگر یہ ان کی ضمنی مصروفیت تھی اپنا زیادہ وقت کچھ ایسا والوں کو دیتے خاص خاص [illegible] ان کے رستے پر ڈالتے تھے پان کی پیک سے گھنی داڑھی [illegible] ہوتی تھی۔ لمبا سا کرتا

اور موٹی لنگی دونوں ہر تیسرے چوتھے روز بدلے جاتے تھے۔ وضو اس اہتمام سے ہوتا تھا کہ چہرہ دُھل کر نکھر جاتا اور کپڑے دیکھ کر کفن یاد آجاتا نماز پنجگانہ کے بعد جو پاس بیٹھتا سکون چین پاتا۔

کچہری جن دنوں ہندوستانی گلی میں تھی راجہ حضرت تقریباً روزآنہ ہی عصر اسی اسمٰعیل صاحب کے ساتھ پڑھتے تھے اور مغرب پڑھ کر یا مغرب سے ذرا پہلے اٹھتے اللہ حاجی مرحوم کے درجے بلند فرمائے ثقہ لوگوں سے سُنا اور اپنا تجربہ بھی یہی بتایا کہ جو اِن سے جتنا قریب رہا شیطان سے اتنا ہی وہ دُور ہوتا گیا۔ ع

چوں رسید اینجا سخن در بند بست

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر

مولوی سید قطب الدین احمد محمودیؒ سحر

حمیرا عزمی

جب میں اپنی کتابِ زیست کے ماضی کے اوراق الٹتی ہوں تو میری نظر اس صفحہ پر پڑتی ہے جس میں چھ سال کی عمر کا ایک انمٹ واقعہ ثبت ہے جسے میں اتنے برسوں بعد بھی بھلا نہ سکی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ میرے ایک ماموں حکیم سید رفیع الدین حسن صاحب کی شادی ہوئی تھی۔ اس شادی میں ہم تین بہنیں زرق برق رنگا رنگ کپڑے پہنے اِدھر سے اُدھر کودتے پھلانگتے پھر رہے تھے کہ یکایک ہماری نظر پُر وقار اور بارُعب فرشتہ نما نورانی صورت باریش بزرگ پر پڑی اور ہم ادباً ٹھٹک کر رہ گئے۔ مودب ہو کر حیدرآبادی طریقۂ آداب کے مطابق تسلیمات عرض کئے۔ ان بزرگ نے خوش ہو کر مسکراتے ہوئے فرمایا "یہ سبز پری، سرخ پری، نیلم پری کہاں دوڑتی پھر رہی ہیں؟ یہ تو لبیدہ کی لڑکیاں معلوم ہوتی ہیں" یہ تھا میرا نانا حضرت سے پہلا شرفِ نیاز! ہم نے انھیں اس سے پہلے بھی دیکھا ہوگا لیکن اس کے نقوش ہمیں بالکل ہی یاد نہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نانا حضرت میرے والد ابو النصر محمد خالدیؒ مرحوم و مغفور کے مربی اور شفیق استاد رہے ہیں۔

مولانا سید قطب الدین احمد محمودیؒ سحر میری والدہ کے حقیقی ماموں ہوتے ہیں جن سے متعلق میں اپنی دیدہ و شنیدہ معلومات کو یہاں سپردِ قلم

کرتی ہوں۔

نانا حضرت کے ذکر سے پہلے خاندانی پس منظر سے متعلق چند باتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں چونکہ آپ کے خاندان میں بڑی جلیل القدر ہستیاں گزری ہیں جن کا شمار دکن کے اولیاء، اتقیاء، اصفیاء، علماء اور صلحا میں کیا جاتا ہے اس لیے ان کے بغیر سلسلۂ حسب و نسب کی بات ادھوری رہ جائے گی۔

پچھلی صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب جب دلّی کا سہاگ اُجڑا۔ نئے نئے ادوار کی، نئی نئی قوموں اور خاندانوں کی عہد بہ عہد تاریخیں لکھی جاتی رہی ہیں اور ایک علاقہ کے لوگوں کی دوسرے مختلف (شمال جنوب مشرق، مغرب کے) علاقوں میں حالات کے تقاضوں کے اعتبار سے ہجرت ہوتی رہی ہے اور اکثریت نے دکن کی طرف جانا پسند کیا۔ میرے عزیز وطن حیدرآباد دکن کو ہر عہد اور ہر حکومت میں یہ سعادت حاصل رہی ہے کہ یہاں کئی دیگر اسلامی ملکوں اور دوسری ریاستوں سے عالم، صوفی، تاجر، صنعت کار ہنرمند اور فن داں غرض ہر طرح کے اہلِ علم اور اہلِ سیف سبھی جوق در جوق آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ چنانچہ مغلیہ عہد کے آخری دور میں یہ زمانہ اورنگ زیب عالمگیرؒ (۱۶۱۸ء تا ۱۷۰۷ء) ایک حسینی سادات سید محی الدین بغداد سے ہندوستان میں قدم رنجہ فرما کر برہان پور (دکن) میں مقیم ہوئے ان کی اولاد نے سلطنتِ آصفیہ کے استحکام میں بڑی خدمات انجام دیں چنانچہ نانا حضرت کے مورثِ اعلیٰ میر حیدر علیؒ، نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی (۱۷۶۲ء ۱۱۷۵ھ تا ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ) کے عہد میں برہان پور سے وارد بلدۂ حیدرآباد ہوئے اور اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ، ہمت و شجاعت اور فنونِ سپہ گری میں کامل ہونے کی وجہ سے خطاب خانی اور منصب سلحداری ماہانہ و پالکی اور دربار شاہی سے سرفراز کیے گئے۔ اور وہ میر حیدر علیخاں اکبر "سیادت پناہ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ بروز جمعہ ۱۲ر جمادی الثانی ۱۲۵۸ھ (۲۹ر جولائی ۱۸۴۲ء م ۸ر شہریور ۱۲۵۱ف) کو واصل بحق ہوئے۔

میر حیدر علی خاں کے صاحبزادے میر پرورش علی حسینیؒ المعروف بہ سید محمد بادشاہ حسینیؒ تھے۔ مروجہ علوم و فنون میں ماہر، حافظ قرآن، شاہ تخلص فرماتے تھے۔ نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس (عہد سلطنت ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء) کے زمانہ شہزادگی میں ان کے اتالیق مقرر ہوئے "رفعت پناہ" کا لقب پایا اور عرصہ تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے لیکن بعد میں حج و زیارت مدینہ طیبّہ سے واپسی پر مستعفی ہو گئے اور کہا: "ایسی بڑی سرکار میں ہاتھ باندھنے کے بعد اب میں کسی اور کے آگے باندھنا نہیں چاہتا"۔ آپ نے کم از کم بارہ حج کئے۔ کئی سال مدینہ طیبّہ میں قیام کیا۔ اسی دوران قیام آپ کے ایک صاحبزادے حضرت سید محمد محمود مکّیؒ (میرے حقیقی پڑنانا) مکہ معظمہ میں تولد ہوئے۔

سید محمد بادشاہ حسینیؒ کے انتقال (بتاریخ ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۸ء) کے وقت آپ کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں:۔

(۱) حضرت سید محمد صدیقؒ محبوب اللہ (عرف خواجہ میاں صاحبؒ۔ تخلص خلق) پیدائش ۲۹ شعبان المعظم ۱۲۶۳ھ "چراغِ ہند" مادہ سال ولادت اور وفات ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۱۳ھ "چراغِ مدینہ" سے سنہ وفات برآمد ہوتا ہے۔ آپ بحر العلوم حضرت سید عبد القدیر صدیقی حسرتؒ کے ہادی اور پیر طریقت، محلہ قاضی پورہ میں "مسجد النور" کے چبوترے پر اپنے والد بزرگوار کے دائیں پہلو میں دفن ہیں۔ عقیدت مند آج بھی در محبوب سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

(۲) حضرت احمد علی شاہؒ۔ پیدائش ۲۹ رمضان ۱۲۷۱ھ۔ وفات ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ (صوفی بزرگ اور شاعر حضرت شائق مرحوم کے والد اور مولوی و مفتی اشرف علی مرحوم کے دادا) تدفین اولیاء باغ (ریشن بازار) میں ہوئی۔

(۳) حضرت سید محمد محمود مکّیؒ (المعروف مکّی میاں صاحبؒ) پیدائش ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ اور وفات ۵ محرم الحرام ۱۳۴۸ھ۔ مزار شریف "حسینی ٹیکری" گلشن باغ۔ آج بھی مقام راحت القلوب اور مرجع خاص و عام ہے۔

(۴) حضرت سید عمرؒ۔ (شمس المفسرین۔ تخلص خلیق) پیدائش ۷ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ۔

وفات ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء۔ "افتخار اولیاء" مادہ سال رحلت۔ پندرہ پاروں کی تفسیر "تفسیر قادری"۔ تاج الدین بن عطاء اللہ اسکندری [م ۷۰۷ھ] کی مشہور کتاب "تاج العروس" کا ترجمہ "رہبرِ طریقت" کے نام سے اور مسائل ترکہ منظوم "فرائضِ قادری" کے نام سے شائع فرمایا۔ فلک نما کے قریب "قادری چمن" میں مدفون ہیں۔

(۵) حضرت انور بیگم۔ [والدہ ماجدہ حضرت بحر العلوم] پیدائش ۲۸ محرم الحرام ۱۲۶۵ھ وفات ۹ رمضان المبارک ۱۳۰۳ھ۔

حضرت محمد بادشاہ حسینی علیہ الرحمۃ پر فیضانِ الٰہی اور رحمتِ ایزدی کی ایسی جلوہ نمائی ہے کہ آپ کے چاروں صاحبزادے بھی حافظِ قرآن، قاری، صاحبِ ارشاد، مفسر اور صاحب تصنیف و تالیف تھے چمنستانِ اسلام کی آبیاری اور میکدۂ عرفان کی ساقی گری کرتے ہوئے علوم ظاہری و باطنی میں ایسا ممتاز مقام حاصل کیا کہ "شموس دکن" کہلانے کے مستحق ہوئے۔ تفصیلی حالات کے لیے "تذکرۂ اولیائے دکن" "گلدستۂ تجلیات" اور "طور تجلّی" ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت سید محمد محمود کمیؒ کے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔

(۱) سید محمد مسعود میاںؒ [م ۲۶ شوال ۱۳۰۹ھ]

(۲) سید قطب الدین احمد محمودیؒ سحر [م ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء]

(۳) سید محمد صدیق رمز محمودیؒ [م ۷ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ] م ۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء

(۴) سیدہ امۃ البتول زوجہ سید نظام الدین [م ۲۲ نومبر ۱۹۷۳ء بمقام کراچی]

(۵) سید محی الدین دستگیر۔

(۶) سید محمد صادق جعفر پاشاہ [م بروز شنبہ ۲۱ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۳ دسمبر ۱۹۷۷ء]

نانا حضرت کی پیدائش کے متعلق متعین طور پر تاریخ و سن کا علم نہیں۔ دریافت کرنے پر بھی ٹھیک معلومات حاصل نہ ہو سکے البتہ قیاس اور اختلاف روایت کی بناء پر اتنا ہی لکھ سکتی ہوں کہ سن پیدائش ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۶ء

ہوگا یا ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۸۹ء۔ نام کی مناسبت سے میری محض خوش گمانی ہے کہ ولادت کا مہینہ ممکن ہے ماہِ ربیع الاول ہو۔ اور کیا عجب کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے عرس کے دن یعنی ۱۴ ربیع الاول کو ولادت ہوئی ہو و نیز میلاد النبی صلعم کے ماہ منوّر کے پیشِ نظر اسم احمد شامل کر کے آپ کو سید قطب الدین احمد کے نام سے موسوم کیا گیا ہو۔ واالعلم عند اللہ۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ راہِ طریقت میں بزرگانِ دین اور اولیاء عظام سے نسبت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ بڑے نانا حضرت (مکّی میاں قبلہ) راوی ہیں کہ ایک دفعہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت بختیار کاکیؒ تشریف لاکر فرما رہے ہیں کہ " ہمارا نام تو اپنے فرزند کے لیے تم نے رکھ لیا لیکن ہمارے نام کا چراغ روشن نہیں کیا؟ آئندہ سے ہمارے نام کا چراغ روشن کیا کرو۔" اس پر آپ چونک پڑے اور ہر سال "چراغ قطب" روشن کرنے اور "کاک کی نیاز" کرنے کا باقاعدہ اہتمام فرماتے رہے اور اپنے صاحبزادہ کو بھی یہ سلسلہ جاری رکھنے کی نصیحت فرمائی۔ چنانچہ ان کی اولاد میں یہ نیاز جاری ہے اور ایک پوتے کا نام بھی یہی رکھا گیا ہے۔

نانا حضرت نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی اور آپ کے اساتذہ کون کون تھے معلوم نہ ہو سکا لیکن اس دور کے دستور اور رواج کے مطابق تعلیم کی ابتداء قرآن، عربی دانی اور فارسی دانی سے کروائی جاتی تھی اور دیگر نصاب تعلیم پر دینی تعلیم کو تقدم حاصل تھا۔ آپ بھی اس طریقے سے مستثنیٰ نہیں رہے ہوں گے۔ اور تعلیم و تربیت مشرقی آداب کے تحت ہوئی ہوگی ـــ البتہ دستاویزی شہادت کی روشنی میں حسبِ ذیل باتیں بلا تامل لکھ سکتی ہوں کہ آپ نے ۱۹۱۵ء (۱۳۲۴ ف مطابق ۱۳۳۴ھ) میں علوم السنہ مشرقیہ دولت آصفیہ کے امتحان کامل شعبہ تفسیر بدرجہ دوم کامیاب کیا۔ ۱۹۱۶ء (۱۵ آبان ۱۳۲۵ ف مطابق ۱۳۳۵ھ) میں دارالعلوم سے مولوی عالم۔ فاضل میں درجہ اعلیٰ میں کامیابی حاصل کرنے کے صلہ میں ۱۶ جنوری ۱۹۱۹ء

(۱۳؍ اسفندر ۱۳۲۸ فصلی مطابق ۱۳؍ ربیع الثانی ۱۳۴۷ ھ) کو حمید الدین صاحب صدر دارالعلوم نے پچاس روپے انعام دیا تھا اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۰ء میں منشی فاضل بھی درجہ دوم میں کامیاب کیا۔

ان مذکورہ تعلیمی مراحل کے علاوہ آپ نے محکمہ بندوبست، صدر محاسبی اور انگریزی کے مروجہ امتحانات بھی کامیاب کر چکے تھے۔ علاوہ بریں آپ کو سائینسی علوم اور طب سے غیر معمولی فطری دلچسپی تھی۔ آپ طبِ یونانی کے مستند حکیم اور طبیب حاذق تھے اور اپنے گھر واقع ترپ بازار میں باقاعدہ مطب بھی چلاتے تھے۔ اس کے علاوہ کرومو پیتھی (رنگین شیشوں کے ذریعہ طریقۂ علاج) کے بھی ماہر تھے آپ نے اپنے مطب میں اعصابی دردوں اور جوڑوں کی تکلیف کے لیے ایک مجرب روغن "پچرس" تیار کیا تھا جو عوام میں بہت مقبول اور شافی تھا۔ جہاں اللہ نے انھیں دینی و دنیاوی علوم میں تبحر اور دسترس عطا فرماکر حیدرآباد کے علماء کی صف میں شمار کروایا تو وہیں علوم باطنی اور روحانی فیض رسانی میں بھی شہرت اور ناموری سے سرفراز کیا۔ شاہیر علماء اور برگزیدہ اسلاف کے خانوادے ہونے کی وجہ سے اپنی محنت اور ریاضت سے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ جیّد عامل اور صوفی بزرگ بھی تھے۔ علمی شغف اور دین و دانش کے مقناطیسی ماحول نے قوائے عقلی کو بے مثال فکر و تدبر سے سنوارا اور طبعی ذہانت و ذکاوت کو نکھارا، ذاتی مجاہدہ، فیوضاتِ روحانی اور تجلیاتِ ربانی نے ظاہری تقویٰ کے ساتھ ساتھ باطنی تقویٰ کو بھی خوب جلا عطا کی۔ ان کی صلاحیتوں اور مقام و مرتبہ کو بہت کم لوگوں نے سمجھا تھا۔ یہاں نکتہ کی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ

ے علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیحؑ و کلیمؑ
علم ہے جویائے راہ فقر ہے دانائے راہ

یہ ان کی مسیحائی کے کرشمے تھے کہ ان کے درِ حکمت سے ایک طرف جسمانی مریض شفایاب ہوکر مسرور نکلتے تھے تو دوسری طرف سحر زدہ، جادو ٹونے

اور آسیب سے متاثر بیمار چنگے ہوکر شاداں نکلتے۔ اللہ نے حکمت و دانائی کے ساتھ ہاتھ میں شفا بھی عطا فرمائی تھی۔ آپ کے عمل اور کشائے فیض کی مثال کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

آپ نے اپنے اہلِ خاندان اور مریدوں کے افادہ کے لیے ایک بیت المال قائم کیا تھا۔ جس میں ضرورت مند امانتیں رکھ کر یا بغیر امانت کے قرضِ حسنہ سے مستفید ہوتے تھے۔ ایک دفعہ جب کہ آپ کا قیام محلہ باغ محی الدین پاشاہ میں تھا آپ گھر مقفل کر کے کہیں مہمان گئے ہوئے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھاکر چور روشن دان سے گھر میں کود اور تجوری توڑ کر اس میں محفوظ زیورات اور نقد رقم بٹور کر رفو چکر ہوگیا۔ گھر کو واپسی پر اس چوری کا علم ہوا۔ اللہ کا نام لے کر مال کی بازیابی کے لیے تین تعویذیں لکھیں ایک بہتے پانی میں ڈالی گئی، دوسری درخت کی شاخ پر باندھی گئی اور تیسری تعویذ چکی کے دستہ کو لپیٹ کر اُلٹا پھرانے کا عمل کیا گیا۔ اللہ بزرگ و برتر اور بدیع العجائب نے نانا حضرت کے تقویٰ اور دینداری کی لاج رکھ لی اور تسخیر عمل سے ایسا غیبی انتظام فرمایا کہ دوسرے دن اس چور نے وہ زیورات کی پوٹلی اور نقد روپیہ مستعملہ رقم کی کمی کے ساتھ چٹھی لکھ کر کھڑکی میں لاکر واپس رکھ دی۔ لوگوں کے زیورات کی امانتوں کی جوں کی توں واپسی پر شکر دگار ادا فرمایا۔ غور کریں تو یہ آپ کی کرامت یا تسخیر عمل سے کم نہیں۔ سلسلہ کے حضرات اگر اس تعویذ یا عمل کا علم رکھتے ہوں تو معلوم نہیں انھیں کس حد تک کامیابی حاصل ہوتی ہوگی اب تک کسی کی زبانی پھر اسطرح کے واقعہ کے اعادہ کی بات معلوم نہ ہوسکی۔ آپ کی قوتِ ارادی بہت مضبوط اور قوی تھی۔ اس کے بل بوتے پر آپ کے تصرفات سے ایسے محیر العقول واقعات سرزد ہوتے تھے لوگ حیرت زدہ ہوجاتے تھے۔ جیسے برتن میں رکھے پانی کو گھور کر دیکھنے سے پانی کھولنا شروع ہوجاتا تھا۔ یا کسی کرسی یا اسٹول کا بغیر ہاتھ لگائے جگہ سے آپ ہی آپ ہٹ جانا

وغیرہ وغیرہ۔ اِسی پر آپ کے اور تصرفات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مسمریزم کہہ لیں یا ہپناٹزم یا اعلیٰ قوت ارادی کی کرشمہ سازی ایسی باتوں کا ظہور امکانات سے بعید نہیں۔ آپ نے علم قیافہ شناسی اور علم نجوم میں بھی ایسی دستگاہ حاصل کی تھی کہ اہلِ غرض آپ کے معتقدین گئے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ علم نجوم کی پیشین گوئی پیش قیاسی پر لوگوں کے عقیدہ میں بہت زیادہ غلو ہونے لگا تو آپ نے اس علم کو ترک کر دیا اور لوگوں کو سختی کے ساتھ تاکید کی کہ وہ آئندہ کبھی اپنے مستقبل سے متعلق کوئی سوال نہ کریں۔ اس طرح آپ نے ان لوگوں کی شخصیت پرستی کے بُت کو توڑا۔

تعلیم و تدریس کی طرف زیادہ رُجحان ہونے کی وجہ سے معلوم نہیں محکمہ بندوبست کی ملازمت کب تک جاری رہی لیکن یہ بات متعین طور پر معلوم ہے کہ نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات کے دور میں ۷/اسفندار ۱۳۳۴ف ۱۹۲۵ء کو آپ کا تقرر مدرسہ فوقانیہ انگریزی چادر گھاٹ بلدہ (حیدرآباد) میں بحیثیت استاذ ہوا۔ اس مدرسہ کے پرنسپل محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم (م پہلے انگریز نومسلم مترجم قرآن پاک بزبان انگریزی مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء) نانا حضرت کا بہت ادب و احترام کرتے تھے اس زمانے کے اکثر سرکاری مدرسوں میں نماز کی ادائیگی کے لیے ایک کمرہ یا ہال مختص ہوتا تھا تاکہ طلباء اور اساتذہ نماز کے اوقات میں وقفہ کے دوران نماز ادا کر سکیں۔ چنانچہ نانا حضرت ہی وہاں کی نماز گاہ میں جماعت کی امامت فرماتے تھے اور محمد پکتھال مرحوم اقتدا کے لیے آپ کا انتظار کیا کرتے۔ آپ کے ممتاز شاگردوں میں جن کے نام یاد آ رہے ہیں اکثر سنی آتی ہوں ان میں قابلِ ذکر ڈاکٹر ابوالحسن صاحب، الطاف حسین (محکمہ مال گزاری) ڈاکٹر معین الدین قادری صاحب، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب ہیں۔ ان کے علاوہ نہ جانے کتنے شاگردوں نے اپنے اساتذہ اور درس گاہ کا نام

بلند کیا ہوگا۔ آپ اسی مدرسہ سے وظیفۂ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اس دوران جامعہ عثمانیہ میں بھی لکچرر کی خدمت کے لیے کوشش کی تھی لیکن زمانہ ساز اور خوشامدی لوگوں نے آپ کو اس حق سے محروم رکھا۔ البتہ نانا حضرت کو دارالترجمہ میں "سیرت ابن ہشام" مصنفہ محمد عبدالملک ابن ہشام کے عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام مل گیا۔ آپ نے اس کام کو باعث سعادت اور زاد آخرت سمجھا۔ اس کا ترجمہ چار حصوں پر محیط تھا چنانچہ ان چار حصوں میں سے صرف دو حصوں کا ترجمہ شائع ہو سکا۔ دارالطبع جامعہ عثمانیہ نے سلسلہ نصاب تعلیم جامعہ عثمانیہ نشان (۳۷۳) کے تحت حصہ اول ۱۹۴۸ء [سنہ ف م ۱۳۵۷ سنہ ۱۳۶۷ھ] میں اور نشان [۳۸۱] کے تحت حصہ دوم ۱۹۴۹ء [سنہ ف م ۱۳۵۸ سنہ ۱۳۶۸ھ) شائع کیا یہ ہر دو نسخے آج کل کم یاب ہیں۔ باقی دو حصوں (حصۂ سوم اور حصہ چہارم] کی طباعت آصف سابع کے زوالِ اقتدار اور سیاسی تبدیلیوں کے باعث نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ آپ کی دو تصانیف کا پتہ چلتا ہے جو پاکستان کو منتقلی کے بعد کراچی سے شائع کروائی تھیں۔ پہلی تصنیف "سائنس اور تصوف" کے نام سے پیر الہٰی بخش کالونی کراچی سے ۱۷ر مارچ ۱۹۵۷ء [م ۱۵ر شعبان ۱۳۷۶ھ] کو چھپی اور دوسری تصنیف "نماز کا برقی نظام" بعد میں شائع ہوئی۔ "سائنس اور تصوف" پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد ظہورالدین بی ایس سی۔ بی ایڈ استاد سائنس اس طرح رقم طراز ہیں۔

"۔۔۔۔ اس کتاب کی خوبیاں اور محاسن گنتا ایسا ہے جیسے ایک ہزار وولٹ کے بلب کے سامنے ۱/۲ وولٹ کا بلب جلانا ۔۔۔۔۔۔ یا مادی ذرہ کی کثافت کا مقابلہ ایتھر کی کثافت سے کرنا ہے۔ یا الکٹرون، پروٹون اور ڈیوٹرون کی حرکات وسکنات کا مقابلہ حرکات بین السالمات سے کرنا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا مجھ جیسے کم علم اور کم فہم کے لیے مشکل ہے کہ سائنس و مذہب کا یہ پیچیدہ مرکب لائبریری کے شعبہ ادبیات

میں جگہ پائے گا یا شعبہ علم الابدان میں یا شعبہ طبیعات میں یا شعبہ کیمیا میں یا شعبہ جوہریات میں؟ اس کتاب کو جگہ دینے کے لیے لائبریری میں ایک نیا شعبہ" جدید طبعی ریڈیائے اسلام" کھولنا پڑے گا...." اس کے نسخے ہندوستان کے اور شہروں کے علاوہ وطن مالوف حیدرآباد بھی بھیجے گئے تھے۔ آپ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی مولانا حسرتؒ نے بھی اس کتاب پر تبصرہ فرمایا تھا۔" نماز کا برقی نظام" کی تصنیف کے سلسلہ میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر بیس سال سے لکھنے کی کوشش تھی لیکن برقی معلومات کی کم مائیگی اور نماز کے بارے میں روحانی برکات کے مقابلے میں مادی مفادات کی کمی کے پیش نظر اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکے لیکن نہ جانے کب سائنس کی کتابیں ہاتھ لگیں اور نظیرالدین احمد عثمانی کی کتاب الطبیعات اور منہاج الدین پروفیسر علوم طبیعات پشاور کی تالیف اور شانتی سروپ کی تصانیف علم البرق وغیرہ کے علاوہ نہ جانے کن کن کتابوں کے مطالعہ کے بعد اپنے ذہن میں جولانیاں لینے والے خیال کو کاغذی پیرہن میں جلوہ گر کئے۔ اس نئی طرزِ فکر کی تصنیف" نماز کا برقی نظام" پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے رشحات قلم سپردِ تحریر فرمائے تھے۔ افسوس کہ "صدق جدید" کا وہ شمارہ دستیاب نہیں اس لیے اس کے تفصیلی حوالے سے قاصر ہوں۔

نانا حضرت کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ انھیں استاد ظہیر کے شاگرد نجم الدین ثاقب بدایونی سے تلمذ حاصل تھا اور وہ سحر تخلص فرماتے تھے۔ آپ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرمائی تھی۔ آپ نے نظمیں، غزلیں، قطعات اور رباعیات لکھیں۔ کہیں کہیں کلام میں ریختہ گوئی بھی نظر آتی ہے۔ بعض وقت اپنے اشعار اور قطعات میں انگریزی ہندی اور فارسی الفاظ کا بھی بے تکلف اور روانی سے استعمال کیا ہے۔ رباعیات اور قطعات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب، اخلاقیات، سماجیات اور تصوف کے مسائل اور قرآنی آیات کو شعر کے سانچوں میں بہت خوبی

کے ساتھ ڈھالا گیا ہے۔ بعض قطعات اور رباعیات میں فکاہی رنگ نمایاں اور اکبر الہ آبادی کی طرح ظریفانہ انداز میں طنز کے چبھتے ہوئے نشتر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ محترم جناب معین الدین عزمی صاحب ان کے منتشر کلام اور چیدہ چیدہ اشعار کی تلاش و ترتیب میں سرگرداں ہیں۔ ان کا ارادہ قابلِ حصول کلام کو مرتب کرنے کا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی یہ کوشش جلد از جلد کامیابی سے ہمکنار ہو تاکہ اہلِ علم اور اہلِ سخن کے لیے زبان و ادب کا یہ تحفہ خزینہ اردو میں اضافہ کا باعث بنے۔ سُنا ہے کہ ان کے کلام کی چند بیاضیں پاکستان کے سفر کے دوران گم ہوگئیں۔ بہرحال موجودہ مختصر شعری سرمائے سے چند شعر بطور نمونۂ کلام ہدیۂ ناظرین ہے۔ میں ان شعروں میں بیان کردہ افکار و جذبات اور احساسات کے نقش ہائے رنگ رنگ کو بغیر تبصرہ اور بغیر ذاتی تاثرات کے سپردِ قلم کرتی ہوں۔ کلام کے حُسن و قبح اور ان کی فکر رسا اور طرزِ ادا، جدتِ خیال اور ندرتِ بیان کا تصفیہ ناظرین خود اپنے ذوق کے مطابق فرمالیں۔

منشی ہیں، مولوی ہیں، فاضل ہیں ہوں، کہتے ہیں کہ تفسیر کا کامل میں ہوں
جتنا جتنا سحر بڑھا علم اپنا ہوتا گیا یہ علم کہ جاہل میں ہوں

گر معیت چاہتے ہو تم رسول اللہ کی بھائیو! معلوم ہے کچھ اس کی ہے تدبیر کیا
مومن آپس میں رہو، پتھر بنو اغیار پر ہے اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّار کی تفسیر کیا

کچھ باپ کے ہیں سحر نہ ہیں بن کے اشعار بھی کچھ ہم نے سُنے ہیں ان کے
عابد ہیں نہ زاہد ہیں نہ رندِ میخوار پر بات ہے ایک، ہیں وہ تکے دُھن کے

سرمہ کی طرح بس۔ کہ جگہ آنکھوں میں پائے تخریب میں پوشیدہ ہے تعمیرِ کسی کی
اتحادی، کانگریسی، مشرقی، لیگی، سبھائی خالی شیشوں کے نظر آتے ہیں سب لیبل مجھے
کانگریسی ہوں نہ لیگی ہوں نہ قومیت پرست مسلمو! اسلام کا کافی ہے اک لیبل مجھے

تیر اغشامیری کوشش اصل میں دونوں ہیں ایک غیریت جب اُٹھ گئی تقدیر کیا تدبیر کیا
وجود میرا انھیں کا نگار خانہ ہے انھیں خود اپنے کمالات آزمانا ہے

وجود ایک ہے ممکن نہیں ہے اس میں دوئی — اسی کو کھونا ہے اے دل! اسی کو پانا ہے
نہ جام سے مری نیت بھرے گی اے ساقی — لگا دے خُم مرے منہ سے اگر پلانا ہے
شوفر کو سر کی بیٹی نے شوہر بنا لیا — بے پردگی کا ہے یہ رزلٹ آزما کے دیکھ
پائے گا زندگانی جاوید اجر میں — سرمایۂ حیاتِ دو روزہ لٹا کے دیکھ
باطل سے دب نہ راہ رو راہِ حق کبھی — بن سرفروش، سر نہ جھکا سر کٹا کے دیکھ
بن سنور کر رات وہ نکلے ہیں ہوٹل کیلئے — امتحاں کا وقت ہے یہ رات شوفر کیلئے
جان دی شبیرؓ نے دینِ پیمبر کیلئے — سر کٹایا، لُٹ گئے، خلاقِ اکبر کے لیے
خواب میں ان کے قدم دیکھے مقدر جاگ اٹھا — خوب چوما، خوب لپٹے پائے انور کیلئے
"میں" "ہی" "تو" تھا شش جہت یکتا تھا "یہ" "تم" نہ تھا — ہم نوا، ہم راز، ہم سر، ہم زباں، ہم دم نہ تھا
تابشِ خورشیدِ محشر کیوں سحر ہوتی نہ سرد — قطرۂ اشکِ ندامت قطرۂ شبنم نہ تھا
خودی رہے نہ رہے ہوش میں رہوں نہ رہوں — مرے پیالے میں یارب! یہ حجاز رہے
مدینہ جاؤں! پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں — اسی بھنور میں الٰہی مرا جہاز رہے
دیکھیں ہیں جلوہ گاہیں ہزاروں ہی یار کی — کعبے سے بھی فزوں ہے مدینہ کچھ اور ہے
مفتی لنڈھائے خم تو ہے حکم اور ہی سحر — لنڈھائے ایک جام یہ فتویٰ کچھ اور ہے
وہ چاہے دل و جاں و ایمان لے لے — میں چاہوں کہ دل دوں دیا جائے نا
یہ ہے لامکاں کے مکیں کا مکان — کسی اور کو دل دیا جائے نا
سہاگن وہی جس کو چاہے پیا — یہ چاہت ہے چاہت یہ حرف آئے نا
ہاں قصرِ خودی ڈھا دے اے ہمتِ مردانہ — ہے کنزِ حقیقت کا مدفن یہی ویرانہ
چھلک جاؤں پلا اتنی اے ساقیٔ میخانہ — پیمانہ یہ پیمانہ، پیمانہ یہ پیمانہ
آتی نہیں خوشامد بس یہی اک بڑا ہے عیب — فضل و کمال، علم و فن، ورنہ سخن میں کیا نہیں
گریۂ اضطراب میں، دیدۂ تر میں کیا نہیں — نالۂ شب میں کیا نہیں آہِ سحر میں کیا نہیں
مجھ میں ہے ساری کائنات، مجھ میں نہاں ہے تیری ذات — تیری نظر میں جب ہوں میں، میری نظر میں کیا نہیں
تو ہے مکانِ لامکاں تجھ میں ہے تیرا رب نہاں — ڈھونڈ نہ تو ادھر ادھر قلبِ بشر میں کیا نہیں
دعائیں ہو نہیں سکتیں کبھی بھی رائیگاں میری — بدل دیتی ہے قسمت کے نوشتہ کو فغاں میری

نہ پوچھ اے ہمنشیں ذوقِ تلاوت ہاں سمجھ لے　　دہن تیرا، زباں اس کی، کلام اس کا زباں میری
دوسروں سے آنکھ کے تنکوں کی ہے جب جستجو　　اپنی آنکھوں کا نظر آئے تجھے شہتیر کیا
طالبِ مولا کو جنت سے نہ دوزخ سے غرض　　تارکِ دنیا کے آگے خاک کیا اکسیر کیا
ہیں مسرور بے خوف و غم اہلِ جنت　　کیا تھا جو کل، آج کام آ رہا ہے
خبر نزع کی ہچکیاں دے رہی ہیں　　ہوئی یاد۔ حاضر۔ غلام آ رہا ہے

چند قطعات اور رباعیات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

اِس سے اُس سے ہر اک سے منہ موڑو　　احباب کی اقربا کی الفت چھوڑو!
حکام سے شاہوں سے نہ رکھو امید　　سب سے توڑو خدا سے رشتہ جوڑو!

اول تو ہے الٰہی آخر تو ہے　　باطن تو ہے اور جو ہے ظاہر تو ہے
انی بک اشھدُ وانت الشاھد　　تو ہے تو ہے حاضر و ناظر تو ہے

ہو جو نیکی کی سحر کچھ جستجو　　کر دو قرباں مال و جان و آبرو
رہ نہ جائے دل میں کوئی آرزو　　لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا

اکبر الہ آبادی کے رنگ میں بھی نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

چل دی گھر سے کنواری بیٹی گھر کی　　تھی اس میں خوشی مدر کی یا فادر کی
بے پردگی کچھ تو ہی بتا آخر کیونٔ　　سر کی بیٹی مسز بنی شوفر کی

کچھ سوچ ذرا صورت دیکھ آنکھیں کھول　　احساس کمتری ہے فیشن کا یہ شوق
سکالر نہیں، مفکر نہیں، نکتہ داں نہیں　　اے مسلمِ ناداں یہ غلامی کے ہیں طوق

آپ نے "نئی روشنی" کے عنوان سے چالیس سے زیادہ اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کے مشاہدے کے بعد جذبات اور احساسات کی ایسی شمعیں روشن کی ہیں جو اس دور کے بدلتے ہوئے اقدار کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ گو کہ اس کلام میں انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہے لیکن شعریت

برقرار ہے۔ مضمون کی طوالت کا خوف اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لطفِ سخن کی خاطر یہاں تفصیل سے قلمبند کروں۔ صرف چند شعروں پر اکتفا کرتی ہوں تاکہ ناظرین اس طرز کا بھی اندازہ فرما سکیں۔

سارے جہاں کو زیر و زبر دیکھتا ہوں میں　　　دورِ فلک بنوعِ دیگر دیکھتا ہوں میں
داڑھی نہ مونچھ مس ہیں کہ مسٹر کسے خبر　　　ایک آدمی کی سی شکل دیکھتا ہوں میں
بگ بارڈن دکھے ہوئے دل کی فغاں ہے یہ　　　لٹتے ہوئے جو قوم کا گھر دیکھتا ہوں میں

آپ نے اسی پر اپنی بات ختم نہیں فرمائی بلکہ "نئی روشنی" والوں کا جواب اور پھر اس کا بھی جواب الجواب قریباً اتنے ہی شعروں میں تحریر فرمایا ہے۔ چند شعر یہ ہیں:-

لندن پلٹ، پلٹ پڑے مجھ پہ جو یہ سنا　　　فرمایا سب یہ اولڈ کلر دیکھتا ہوں میں
آئی تھینکیو متحیر ہو بڑے خیر خواہِ قوم　　　ہاں دل میں درد، سوزِ جگر دیکھتا ہوں میں
روزے تو وہ رکھیں جنھیں کھانے کو کچھ نہ ہو　　　جن مسلموں کو فاقہ بسر دیکھتا ہوں میں
فرصت کہاں کلب سے کہ مسجد کا رخ کروں　　　اور جب کہ اس کو اس سے کور دیکھتا ہوں میں
کیڑے مکوڑے کھائیں گے باڈی کو آپ کی　　　پامال لاکھوں کاسۂ سر دیکھتا ہوں میں

نانا حضرت کی شاعری سے متعلق اس مختصر سے تعارف کے بعد ان کی زندگی کے اور پہلوؤں کی جانب آپ کی توجہ مبذول کراؤں گی۔ غالباً ۱۹۴۶ء کی بات ہوگی کہ نانا حضرت کی ایڑی میں کچھ زخم نمودار ہوا اور بڑھتے بڑھتے ناسور کی شکل بن گئی اور پیر متورم ہو گیا۔ گلاب خاں جراح سے وقتاً فوقتاً نشتر لگواتے رہے زخم صاف کیا جاتا اور پٹی باندھ دی جاتی۔ افاقہ نہ ہوا تو ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا گیا۔ انھوں نے عمل جراحی کی تجویز کی۔ لیکن چونکہ ایلوپیتھی انجکشن اور دوائیوں میں الکوحل کا جز شامل رہتا ہے اس لیے آپ نے ان کا استعمال تقویٰ کے خلاف تصور فرما کر نہ انجکشن لگوائے اور نہ ایلوپیتھی علاج کروایا بلکہ یونانی ذریعہ علاج ہی کو ترجیح دی۔ ہندوستان کی تقسیم کے ایک سال بعد حیدرآباد پر ۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پولیس ایکشن ہوا۔ اس کارروائی کی خونین داستانیں سنیں اور اخباروں میں پڑھیں

تو احساس ہوا کہ اب وطن آزاد نہیں رہا۔ بادشاہِ وقت کی خود مختاری جاتی رہی دین و حرّیت کی سلامتی خطرہ میں نظر آئی اور غلام ریاست میں رہنا گوارا نہیں ہوا تو آپ نے اللہ سے رجوع ہو کر استخارہ دیکھا اور وطن سے ہجرت کا قصد کیا۔ چنانچہ آپ نے دوشنبہ غرہ شعبان ۱۳۶۸ھ م مئی ۱۹۴۹ء کو ہجرت کی نیّت سے بحری جہاز کے ذریعہ عازم پاکستان ہوئے۔ جاتے وقت بمبئی میں قیام کے دوران اپنے منجھلے صاحبزادے جناب حکیم سید رفیع الدین حسن صاحب کو خرقۂ خلافت عطا کئے اور پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھا علمی معروفیت کے لیے اپنی ساری کتابیں بھی ساتھ لیتے گئے۔ اس ترکِ وطن اور اپنے اس ہجرت کے واقعہ کو بھی آپ نے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔

تقسیم ہند اور حصولِ آزادی کے بعد ابتدائی عبوری دورِ حکومت ہر دو مملکتِ برصغیر ہند و پاک کے لیے بڑا ہی انتشاری اور آزمائشی دور گزرا ہے۔ پاکستان پہنچنے والے مہاجرین پر کیا کیا بیتی اس کی الگ داستان ہے۔ خاندان کے خاندان آگ و خون کے دریا پار کر کے دونوں علاقوں میں بٹ گئے ٹوٹ گئے۔ "انقلابِ دہر ایسے ویسے۔ کیسے کیسے ہو گئے اور کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے؟!" کے مصداق نظارے دکھاتا رہا۔ بعض مہاجرین کے حق میں پاکستان جنّت نشان ثابت ہوا تو بعض کے حق میں مقامِ درد و فغاں! ہر آن نئی شان ہر لمحہ نیا امتحان! اس دور کی شاعری، تاریخی مضامین، تنظیمی تحریکیں، افسانے، ناول، تذکرے، آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں واقعات اور حقائق سے پُر ہیں۔ چار دہے بیت چکنے کے باوجود آج بھی پاکستان میں مہاجر "مہاجر" ہی ہے۔ ان کے حقوق اور مسائل کا حل ایک سوالیہ علامت بنے ہوئے ہیں! غرض یہ کہ نانا حضرت نے ہجرت کے بعد تسلیم و رضا کے پیکر بن کر وہ سب کچھ صبر و استقامت کے ساتھ سہا جو وہاں کے بعض امتحان طلب مہاجرین کو سہنا پڑا۔ تنگ و تاریک مہاجرین کیمپ کی جھگیوں میں ہر موسم کے سرد و گرم کے ساتھ موسم برسات کی برکتیں بھی جھیلیں۔ بارش

برس کر تھوڑی دیر میں ختم جاتی لیکن چھتیں ہیں کہ کافی دیر تک برستی رہتیں۔ تصوّر کیجئے ان جھگیوں میں کیسے روز و شب گزارے تھے۔ کیا یہ سچ ہے کہ جن کے رُتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے؟ اس کے باوجود عزم و عمل کے مردِ آہن نے اپنا علمی مشغلہ جاری رکھا اور وہیں سے اُنھوں نے اپنی مذکورہ دو تصانیف شائع بھی کروائیں اور بھی کاموں کی اشاعت کے آرزومند تھے لیکن صحت کی خرابی اور ثروت کی کمی نے موقع نہیں دیا۔ مسودات ہوں تو ہوں مجھے اس کا علم نہیں۔ ان کے صاحبزادوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کام کی طرف متوجہ ہوں۔

آپ کے پاؤں کی تکلیف اس قدر بڑھی کہ عضوِ ماؤف گھٹنے تک کٹوانا پڑا۔ بعد میں مصنوعی پاؤں بھی لگوایا گیا۔ عزیز و اقربا کی محبت تڑپانے لگی اور وطن کی خوشبو یاد آنے لگی تو نانا حضرت اواخر ۱۹۵۴ء میں حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اپنے برادرِ حقیقی مولوی سید محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ محمودی کی بڑی صاحبزادی کی شادی [منعقدہ جنوری ۱۹۵۵ء] میں بھی شریک رہے اور چند ہفتوں بعد کراچی واپس لوٹ گئے۔ اسی طرح پھر دوسری اور آخری مرتبہ ۱۹۶۱ء میں بھی حیدرآباد کا دورہ کئے تھے جب کہ ان کے چھوٹے صاحبزادے جناب سید محمد مدنی صاحب کا عقدِ ازدواج حیدرآباد ہی کے ایک خاندان میں طے پایا تھا۔ دونوں دفعہ جب آپ حیدرآباد تشریف لائے تھے تو چند روز ہمارے یہاں اڈی میٹ میں بھی قیام فرماتے۔ اب کی بار جو قریب سے دیکھنے اور خدمت کرنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ ؏

جو خاصانِ خدا ہیں ان کی صورت ایسی ہوتی ہے

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ استخارہ دیکھنے کے بعد آپ نے پاکستان ہجرت فرمائی تھی اور یہاں سے نانی اماں کو ساتھ لیے بغیر ہی روانہ ہو گئے تھے کیوں کہ نانی اماں اپنی والدہ محترمہ کی خاطر حیدرآباد اتنی جلدی چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ بالآخر وہ بھی اپنے سرتاج سلامت کی خدمت اور ان کے دکھ بانٹنے کے لیے سال ڈیڑھ سال بعد پاکستان سدھاریں۔ نانی اماں کا

تعلق ایک دیندار متمول خاندان سے تھا۔ وہ میر عنایت علی مرحوم جاگیردار پائیگاہ معین الدولہ کی صاحبزادی تھیں۔ جنھوں نے اپنے ایک صاحبزادے میر تراب علی مرحوم یعنی نانی اماں کے برادرِ حقیقی کی شادی حیدرآباد کی قدیم بزرگ شخصیت جمال الدین خان بہادر صادق جنگ ملکم (م ۱۳۴۷ھ) کی صاحبزادی سے کی تھی جو ایک مدت تک حضور غفران مکان کے اے ڈی۔سی اور شاہزادہ میر عثمان علی خاں ولی عہد بہادر آصف سابع کے اتالیق رہے۔ نواب صادق جنگ بہادر ثالث نواب منیر الدین خاں صادق جنگ ثانی کے خلف اصغر تھے جن کے جد اعلیٰ قاضی بدر الدین حسین خان تھے۔ تفصیلات کے لیے فرامین آصف جاہی اور تو زک محبوبیہ ملاحظہ فرمائیے۔

نانی اماں کے ذکر کے ساتھ ان سے وابستہ یادوں کی ویڈیو کیسٹ نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ ان کی شخصیت ایسی جامع صفات تھی کہ وہ خود ایک اسلامی معاشرہ کی مثالی زندگی کا نمونہ تھیں جس کے لیے ایک علاحدہ کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ نیک، دیندار، سلیقہ شعار، خوددار، ملنسار، ہمدرد، اقرباء نواز، شفیق و غمگسار، بزرگِ خاندان، منتظم مزاج اور صاحبِ کردار ایسی خاتون تھیں کہ اہلِ خاندان کا کوئی کام ان کے مشورے اور سرپرستی کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے نوکر چاکر ہونے کے باوجود وہ ہر کام میں خود بھی ہاتھ بٹاتیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھتیں۔ یہاں تک کہ نانا حضرت کے مطب کی دوائیوں کی تیاری میں بھی ان کی ہدایت اور نگرانی شامل رہتی۔ اس موقع پر مجھے ایک شنیدہ واقعہ یاد آیا جس سے ان کے ظرف اور کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ جب میری حقیقی نانی امی حضرت امتہ البتول [دختر حضرت مکی میاںؒ] کی شادی طے ہوگئی تو مالی مشکل کو دور کرنے کے لیے نانا حضرت [حضرت قطب میاںؒ] نے نانی اماں سے کہا کہ وہ اپنے طلائی زیورات مقداری ڈیڑھ سیر کفالتی قرض حاصل کرنے کے لیے دیں تاکہ والد کی فکر و پریشانی دور ہو اور

بہن کی شادی کا انتظام ہو سکے۔ نانی اماں نے اپنے والد (میر عنایت علی مرحوم جاگیر دار پائیگاہ معین الدولہ) کو اس بات سے آگاہ کیا تو انھوں نے کبھی ہندو ساہوکار کے ہاں زیور رہن رکھنے کو خاندانی عزت و وقار کے خلاف تصور کر کے مشورہ دیا کہ زیورات کا فروخت کرنا کسی ساہوکار کے ہاں مکفول کرنے سے زیادہ قابلِ ترجیح ہوگا۔ نانا حضرت زیور فروخت کرنے کی تجویز سے متفق نہیں تھے اور ایک طرح سے خفا اور ناراض ہو گئے۔ کسی اور ذریعہ سے اللہ نے رقم کا انتظام کر دیا۔ شادی کے روز نانا حضرت نے اپنی اہلیہ محترمہ کو زیورات پہنے ہوئے دیکھا تو ان کی طرف ایک ایسی نگاہِ برق انداز ڈالی کہ جس میں بھرپور شکوہ تھا کہ "آپ نے میری بہن کی شادی کے لیے زیور نہیں دیئے اور اپنی زیوروں میں آراستہ کھڑی ہو!" نانی اماں کی نظروں نے ان شرربار نگاہوں کو تاڑ لیا اور وہ اس تقریب کے بعد جو زیورات اتار دیئے تو پھر عمر بھر کبھی نہیں پہنے۔ بلکہ جب فراخ دستی متاثر ہونے لگی تو نانی اماں نے اپنے زیورات فروخت کر کے کسی تجارتی کمپنی کے حصص خرید لیے اور اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کیا۔ اس طرح نانی اماں میری نظر میں دکن کی تہذیبی، دینی اور علمی گھرانے کی محبت اور شفقت کرنے والی سلیقہ مند معتبر خاتون کی علامت تھیں۔ مجھے ان کی طرزِ زندگی کے کتنے ہی اصول اہلِ خاندان کے لیے قابلِ تقلید معلوم ہوتے ہیں۔! نانی اماں کو اپنے خسر حضرت سکّی میاںؒ کی بھی جائے پیدائش مکّہ معظمہ کی نہ صرف زیارت کا شرف حاصل ہوا بلکہ اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ ۱۹۶۳ء (م ۱۳۸۲ھ) میں حج کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

نانا حضرت کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد تفصیلی حالات کے خاطر خواہ معلومات نہیں ہو سکے۔ جو بھی ناکافی معلومات ہیں وہ دوسروں کے نام خطوط اور سماعی اطلاعات پر منحصر ہیں۔ وہاں بھی آپ کے درس و تدریس کا سلسلہ برقرار رہا۔ دکن کے علماء سے حاصل کیا ہوا علمی سرمایہ ذوق و شوق رکھنے والوں میں

تقسیم کیے۔ تشنگانِ علم کے لیے آپ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے اور مسندِ رُشد و ہدایت سے آپ کا فیضِ باطن بھی جاری تھا۔ بیسیوں نے آپ کے دستِ فیض پر بیعت کر کے گنجِ مخفی کی دولت پائی اور روحانی مدارج طے کیے۔ آپ نے اپنی اہلیہ اور دو صاحبزادوں کے ساتھ حج کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اجازت مِل گئی۔ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ علالت کی نوعیت اور اس کی تفصیل کا مجھے عِلم نہیں لیکن نانا حضرت کے اِس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہونے سے پہلے کا یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے جس نے سارے خاندان میں بہت شہرت پائی۔ آپ کے ذہن میں حج کو جانے کی جو دھن سوار تھی تو ہر وقت طیبہ کی یاد اور مکّہ مکرمہ کے ارضِ مقدس اور کعبتہ اللہ کا تصوّر چھایا رہتا۔ آپ گھر کے صحن میں یا دروازہ کے باہر نکل کر بیٹھے بیٹھے (ایک پاؤں سے معذور ہونے کی وجہ سے) ہاتوں کے بل پیروں سے گھسیٹے ہوئے گول گول چکر لگاتے نانی اماں دریافت فرماتیں "یہ آپ کیا کر رہے ہیں"؟ تو آپ جواب میں فرماتے "میں کر دیکھتی نہیں کعبتہ اللہ کا طواف کر رہا ہوں۔ حج میں ہوں!" یہی جملہ دہراتے اور گشت کرتے رہتے۔ یہ عمل ہوش میں بھی جاری رہتا اور کبھی عالمِ بے خودی میں بھی! رمز شناسانِ شریعت، سالکانِ راہِ طریقت، عارفانِ بادۂ حقیقت کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ وہ کب کس منزل میں ہوتے ہیں وہ جانیں یا ان کا خدا جانے!

خاصانِ خدا خدا نباشد ✽ لیکن ز خدا جدا نباشد

علالت کا سلسلہ جاری تھا۔ سب خوشی خوشی حج کی تیاریوں میں مصروف تھے لیکن نانا حضرت اپنے سفرِ حج پر روانہ ہونے سے پہلے ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ (م ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء) کو آخری سفر پہ روانہ ہو گئے اور اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کردی۔ اِنّا لِلّٰہِ واِنّا الیہِ راجعون۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کے شبوں کا گداز

اس طرح کراچی سے گورستان۔

ناناحضرت کی آخری آرام گاہ بن گئی۔ رمضان شریف میں آپ کے وصال کی وجہ سے نانی اماں کو حج کے سفر میں آپ کی معیت اور ہمراہی نصیب نہ ہوسکی۔ حج سے فراغت کے کچھ عرصہ بعد نانی اماں حیدرآباد واپس ہوگئیں۔ ان کی مثالی زندگی کا سفر ۵ رجب المرجب ۱۳۸۵ھ [م ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء] کو تمام ہوا اور وہ بھی راہئ ملک بقا ہوگئے۔ درگاہ حضرت مکیؒ میاںؒ حسینی ٹیکری کشن باغ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

آپ کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی' جن میں دو صاحبزادے آپ سے پہلے ہی پاکستان ہجرت کرچکے تھے اور دو صاحبزادے اور ایک دختر حیدرآباد میں مقیم رہے۔ [۱] سید شجاع الدین حسین مرحوم عرف خلیل پاشاہ خلیفہ و سجادہ نشین درگاہ حضرت سید محمود مکیؒ۔ ملازم معتمدی تعلیمات۔ حیدرآباد۔ [م بروز یکشنبہ ۱۱ر جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۳۱ر جنوری ۱۹۸۸ء]۔ [۲]: حکیم سید رفیع الدین حسن عرف مبارک پاشاہ۔ مقیم حیدرآباد۔ خلیفہ حضرت احمد محمودیؒ۔ [۳]: الحاج سید ناصر الدین محمود مکی عرف قبلہ پاشاہ [ام۔کام] خلیفہ حضرت احمد محمودیؒ صاحبِ تصنیف و تالیف۔ مبلغِ دین۔ متمکن مسندِ خلافت و رشد وہدایت۔ کراچی [۴]: الحاج سید محمد مدنی محمودی عرف مدنی پاشاہ ملازم پی۔آئی۔اے [پاکستان] [۵]: سیدہ امتہ القادر فاطمہ مرحومہ [م ۱۲ر ڈسمبر ۱۹۷۰ء]۔

ان سب میں موروثی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ حسن اخلاق، خلوص' دینداری اور زہد وتقویٰ۔ ہر ایک کے صفات اور کردار کا جائزہ لینا یہاں بے محل ہوگا۔ البتہ سرسری طور پر دو ایک باتیں ضرور بتانا چاہوں گی کہ جب ترکہ کے مال واسباب کی فہرست سازی ہوئی اور تقسیم کی نوبت آئی تو برادر بزرگ [خلیل پاشاہ ماموں] نے چھوٹے بھائیوں سے خواہش کی وہ اپنی اپنی پسند یا ضرورت کی اشیاء اٹھالیں جو بچ رہے گا وہ ان کا حصہ! چناں چہ اس کا

عملی ثبوت دے کر اپنے بڑے پن اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ قبلہ پاشاہ ماموںؒ کو ابتداء میں بنک کی ملازمت ملی تھی چوں کہ بنک کے کاروبار سودی لین دین ہوتا ہے کچھ دن کام کرنے کے بعد بغیر تنخواہ لیے اس کی آمدنی کو حرام خیال فرما کر فوراً نوکری ترک کر دی۔ نانا حضرت کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ پیر کٹوانا گوارا کیا لیکن محض الکوحل کی دوائیوں میں آمیزش کے خیال سے ایلوپیتھی علاج کروانے سے گریز کیا۔ انہی کے یہ سپوت بنک کی نوکری چھوڑ کر تقویٰ اور اکل حلال کو اپنایا۔ حضرت ابو نصرؒ کی شخصیت اور برگزیدگی محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ غوث پاکؒ کی اولاد سے تھے۔ جن کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد سیکڑوں نہیں ہزاروں میں ہے۔ جب وہ بیمار ہوئے تو وصیت فرمائی کہ "مجھے قبلہ پاشاہ غسل دیں اور جنازہ کی نماز پڑھائیں"۔ ایسا ہی کیا گیا اور یہ سعادت قبلہ پاشاہ ماموں کو حاصل ہوئی۔ دیکھئے نمونۂ اتباعِ رسولؐ، نسبتِ خاص، باہمی تعلقات، مناصب اور مراتب! جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔

نانا حضرت ایک بزرگ زادہ تھے۔ ولی اللہ، صوفی، عالم، فاضل، معلم، مفسر، طبیب، شاعر، قیافہ شناس، منجم، مترجم، مصنف، دینی رہنما، مرشد اور عارف کامل! ان کی زندگی کا ہر پہلو نئے عنوان کا محتاج ہے۔ ایسی گوناگوں قابلیتوں کی حامل شخصیت پر یہ مختصر مضمون لکھنے سے میری غرض و غایت ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان کی ولایت، شرفِ بزرگی، دینی، علمی، ادبی، شعری اور ملی خدمات کا جائزہ لوں۔ میں اپنے آپ کو قطعاً اس کی اہل نہیں پاتی۔ یہ کام مجھ سے زیادہ لائق، قابل اور اہل لوگ کر سکتے ہیں۔ نانا حضرت میرے والد کے استاد تھے۔ ان سے جو بن پڑا انھوں نے اپنی زندگی میں کیا۔ میں یہ چند سطریں ان کی خدمت میں بطور ہدیۂ نیاز پیش کرتی ہوں۔

میری معلومات ناقص نہ سہی محدود ضرور ہیں۔ اتنی مختصر یادوں کے سہارے اتنی بڑی ہمہ جہتی عظیم شخصیت کے بارے میں یہ دھندلے نقوش بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔

ع۔ قلم اینجا رسید و سر بشکست

اے متاعِ عزتِ پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ! وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں

افضل العلماء مولانا سید عبدالباقی شطاریؒ

ڈاکٹر اشرف رفیع

مولانا سید عبدالباقی شطاری کا سانحۂ ارتحال ایک ایسا جاں گداز المیہ ہے جس کو علمی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ مولانا کے تبحرِ علمی کی مثال سوائے متقدمین کے متاخرین کے گروہ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ اس سرچشمۂ علم وفضل کی کمی کو صرف وہی تشنہ کامانِ علم وادب محسوس کرسکتے ہیں جن کو خوش قسمتی سے آپ کے بحرِ بیکراں علمی فیضان سے بہرہ ور ہونے کا موقع حاصل رہا ہے۔ قیامت یہ ہے کہ یہ عظیم شخصیت علم الادیان و علم الابدان کی پرستش میں بے مثال وبے کراں استعداد تامہ رکھتے ہوئے شہرت کے حدود سے بہت دور نام ونمود سے بے نیاز صرف ان طالبانِ علم وفن کی خدمت میں مصروف رہی جن کا مطمحِ نظر صرف علم کی بلندیوں کو چھولینا ہے۔

۱۰ر جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ (۱۱ر فروری ۱۸۸۹ء بروز دوشنبہ) کو کتم عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے والی یہ شخصیت ابتداء ہی سے کسبِ کمال وفن کا جذبہ فطرتاً ساتھ لائی تھی ـــــ عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم مختلف اہلِ علم سے حاصل کرنے کے بعد حدیث وفقہ وادب کی اعلیٰ تعلیم اپنے عم محترم حضرت سید غلام غوث شطاریؒ سے حاصل کی۔ منطق، فلسفہ اور ہیئت میں مولانا عبدالواسعؒ سے تلمذ حاصل رہا ـــــ یوں تو آپ نے کئی علمائے کرام سے درسِ نظامیہ کی تکمیل فرمائی لیکن ان کے منجملہ صرف متذکرہ دونوں اساتذہ کی مشفقانہ ومربیانہ علمی توجہات کا ذکر بطورِ خاص

فرمایا کرتے تھے۔

آپ کی تعلیمی جدوجہد اور علمی تشنگی کی یہ خصوصی جہت ہے کہ آپ نے درسِ نظامیہ کی تکمیل سے پہلے کسی امتحان میں شرکت کا عزم تک نہ کیا۔ مکمل استعداد علم و ادب کے حصول کے بعد سب سے پہلے پنجاب یونیورسٹی سے "کامل الکلام" ہوئے اور اسی سال دو یا تین ماہ کے فرق سے مدراس یونیورسٹی سے افضل العلماء کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد مزید امتحانات میں کامیابی کا شوق بڑھتا گیا۔ یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ افضل العلماء کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور اس کے بعد منشی فاضل کے امتحانات میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ بعد فراغ منشی فاضل، آپ نے CERTIFICATE IN PROFICIENCY کے لیے مقالہ لکھا۔

علوم متداولہ میں تبحرِ کامل حاصل ہونے کے بعد علمی طلب نے فنِ طب کا رُخ کیا اور طبِ یونانی کے شعبہ عربی سے طب میں کامیابی حاصل کی جسے آج کی اصطلاح میں طبیب ماہر کہا جاتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ کو اپنے چچیرے دادا حضرت سید شیخن احمد صاحب شطاری (سوم) رحمتہ اللہ علیہ سے سلسلہ عالیہ شطاریہ میں بیعت کا شرف حاصل تھا۔

دورانِ تعلیم ہی سے مختلف فنون کی طرف مائل رہے۔ جن فنون میں آپ نے غیر معمولی مہارت حاصل کی ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ کشتی، پنجہ کشی، بنوٹ وغیرہ میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ پنجہ کشی اور بنوٹ میں وحید العصر مانے جاتے تھے۔[1]

---

[1] آپ کی اس مہارت کا ذکر زباں زد عام و خاص تھا۔ اس دور میں ہر طرف آپ کے نام کے چرچے ہوتے تھے۔ "مملکت آصفیہ" [مرتبہ ڈاکٹر محمد عبد الحی مطبوعہ کراچی اشاعت دوم ۱۹۸۶ء ص ۴۲۵-۴۲۶] جلد اول میں "فنون سپہ گری: بنوٹ" کے زیرِ عنوان مضمون نگار اس طرح رقم طراز ہیں کہ ... بنوٹ کے ماہرین کا تذکرہ ادھورا رہیگا جب تک کہ مولانا سید عبد الباقی شطاری ... کا نام نہ لیا جائے ... چار آدمی چار چار سمتوں سے پتھر پھینکتے تھے اور یہ پتھروں کو لکڑی سے روک لیتے تھے۔ [عزمی]

وثوق کے ساتھ اس بات کو مانا گیا ہے کہ باوجود آپ لاغر اندام اور نحیف الجثہ ہونے کے سنِ کہولت میں بڑے بڑے ماہر پنجہ کش آپ کا ہاتھ نہ موڑ سکتے تھے۔ اب اس سے آپ کی تیاری کے زمانے کا قیاس با آسانی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان فنون میں بھی آپ کے متعدد شاگرد موجود ہیں۔ فنون لطیفہ میں آپ کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ جس طرح بنوٹ میں استاد غلام نادر سے اکتساب فن کیا تھا، اسی طرح استاد مولوی برہان الدین نگینؔ سے وہ کمال فن حاصل کیا کہ ستار کے بڑے بڑے ماہر اساتذہ کو آپ پر رشک ہونے لگا۔

طلبِ صادق ابتداء ہی سے فطرت میں ودیعت تھی۔ کسی علم یا فن کے اکتساب میں اس قدر دُھن کے پکّے تھے کہ اس میں درجہ کمال حاصل کرنے تک چین نہ لیتے تھے۔ شوق کی انتہا اس واقعہ سے سمجھ میں آتی ہے کہ فنِ کُشتی کے ایک خاص داؤ کے حصول کے لیے دہلی کا سفر اختیار کیا اس لیے کہ اس خاص داؤ کے جاننے والے کوئی صاحب دہلی ہی میں تھے۔

علمی ذوق تو خاندانی تھا۔ اس پر سلوک و تصوف کی عملی تعلیم کے نمونے خود گھر ہی میں موجود تھے۔ آستانہ عالیہ شطاریہ کے سارے بزرگ روحانی رفعتوں کے حامل تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس خاندان کی امتیازی خصوصیت ہے کہ علمِ باطن کے ساتھ ساتھ علمِ ظاہر کی بلندیاں اس سلسلہ عالیہ کے ہر بزرگ کا حصہ بن گئی تھیں۔ پھر مولانا عبدالباقی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی فیضان کے ازدیاد میں ان کے ننھیال کا بھی بڑا حصہ شامل ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ دلّی کے مشہور بزرگ سید محمد حسن جیلی کلیمی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت سید حسن جیلیؒ وہی بزرگ ہیں جن کو عالمِ رویاء میں حضورِ انورؐ صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب بابُ العلم حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے کچھ خاص انداز سے ہدایتیں دی تھیں اور صبح بیدار ہونے کے بعد آپ نے یہ کہہ کر کہ "اب دلّی قابلِ رہائش مقام نہیں" دکن کی طرف ہجرت کی۔ اور اس نقل مقام کے فوراً بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ظہور پزیر ہوا۔

مولانا کے والد حضرت سید صلاح الدین شطاری جو حضرت سید شیخن احمد شطاریؒ اولی کے پوتے تھے، ان کا شمار حضرت مولانا انوار اللہ صاحب المخاطب بہ فضیلت جنگ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا۔ اس طرح والد و والدہ کی دونوں نسلیں مولانا کی روحانی بلندیوں میں ممد معاون رہیں اور انجام کار مولانا سید عبدالباقیؒ کو نہ صرف علوم عربیہ و عجمیہ کا اس نسبت نے متبحر، فقید المثال عالم بنا کر منطق، فلسفہ، ہیئت اور طب میں دستگاہِ کامل بخشی بلکہ طریقت وسلوک میں ایک فقیر کامل، دولت اور شہرت سے بے نیاز، صبر و رضا کا پیکر بنا دیا۔ محض عالم یا محض فقیر ہونا مشکل نہیں لیکن علم و فقر کے امتزاج کی مثال مولانا سید عبدالباقیؒ کی شخصیت میں مکمل طور پر نمایاں ملتی ہے۔ علم محض "خود را بیش کن" کا مقتضی ہوتا ہے اور فقر محض "ترکِ خویش کن" کا نعرہ لگاتا ہے لیکن فقر و علم کے امتزاج نے جہاں استاد محترم مولوی سید عبدالباقیؒ کو صبر و توکل کا مجسمہ بنائے ہوئے تھا، وہاں زندگی بھر تشنگانِ علم کی سیرابی اور علمی خدمت ہی ان کا شعار بنی رہی۔ اس امتزاجِ علم و فقر یا شریعت و طریقت کا یہ اثر جہاں مولانا کی عظمت، انانیت سے یکسر خالی تھی وہاں آپ کی فقیری و توکل احساس زُہد سے بالکل منزّہ تھے۔

علم کی تعریف کیجیے تو فرماتے "بابا میں تو کچھ نہیں جانتا، ابھی ایک طالب علم ہوں" زہد و فقر کا ذکر کیجیے تو ارشاد ہوتا "میں گنہگار تو اس کے کرم بے کراں کا امیدوار ہوں!"

مولانا کے علمی مشاغل نے آپ کو وسیع مطالعہ کا موقع فراہم کیا اور فلسفۂ مذاہبِ عالم پر آپ کے بے پناہ معلومات نے آپ کو ممتاز مقام عطا کیا تھا۔ چنانچہ علامہ کی ہمہ دانی اور ہمہ گیری نے بعض مغربی مستشرقین کو بھی محو حیرت کر دیا۔ میک گلِ یونی ورسٹی کینیڈا کے شعبہ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر جان اسمتھ نے اسلامیات پر مولانا سے گفت وگو کی اور اس گفت وگو سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مولانا کو کینیڈا میں پروفیسری کا پیشکش کیا۔

دنیائے علم کا اہم ترین کارنامہ جو مولانا نے انجام دیا وہ یہ ہے کہ امام فخر الدین رازی کی کتاب "مباحثِ مشرقیہ" اور مصر کے نابینا عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی "الایام" کا ترجمہ ہے[1]۔ حال آں کہ ہندوستان کے بارہ منتخب علمائے کے ترجمے مسترد ہو چکے تھے — مولانا کے ترجمے سے مولانا ابو الکلام آزاد اس قدر متاثر تھے کہ مولانا سے ملنے کی کئی دفعہ خواہش کی لیکن خوفِ تشہیر نے آپ کو ملاقات سے باز رکھا۔

ضروریات علمی کی تکمیل کے مدِ نظر صرفِ خاص مبارک میں ملازمت بھی اختیار کی جہاں سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ طبّیہ کالج میں جز وقتی لکچرار رہے لیکن سوائے رخصت کے کبھی زندگی میں ملازمت یا ترقی کے لیے درخواست نہیں کی۔ صرفِ خاص مبارک اور مدرسہ طبّیہ کی ملازمتیں بلا درخواست مولانا کو طلب کر کے دی گئی تھیں۔

ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کرنے کے بعد مجھے مولانا سے عربی پڑھنے کا موقع ملا اور ایک عرصہ تک بہت قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ آپ کے علم و عمل میں کوئی فصل نہ تھا۔ میری کم سواد نظر نے یہی جانا کہ آپ کا علم عینِ عمل ہے اور آپ کا عمل عینِ علم! آپ کے حلم آپ کی منکسر المزاجی آپ کی سیرت کے گوشوں کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہے البتہ آپ کا ہر قول اور ہر فعل انسانیت کے اتنے بلند معیار کا حامل تھا جو صرف ایک انسانِ کامل ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔ درس و تدریس کا طرز کچھ اس قدر انوکھا اور تفہیم اس قدر دل نشین تھی کہ کم سواد طالب علم بھی حاصل

---

[1] یہ ہر دو تراجم اب بالکل کم یاب ہیں۔ ان کے علاوہ ایک بصیرت افروز مقالہ "مسئلہ امامت اور علامہ شہرستانی" ہے جو "برہان" جلد ۲۹ (جولائی ۱۹۵۲ء ص ۵-۲۹) میں شائع ہوا آٹھویں صدی ہجری کے قاضی القضاۃ مصر و شام علامہ بدر الدین محمد ابن جماعہ (م ۱۳۳۳ء) کی کتاب "تحریر الاحکام" کا ترجمہ "اسلامی نظم و نسق" (م ۱۹۵۹ء) بھی بہت مقبول ہوا (م۔ د۔ عزمی)

کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ میں نے کالج کے ممتاز اساتذہ سے درس لیا ہے لیکن مولانا کے طریقۂ تعلیم نے مجھ پر نئی راہ کھول دی جو خود میری موجودہ معلمانہ زندگی کیلئے شمع منزل سے کم نہیں۔

گذشتہ سال ۷ رمضان ۱۳۹۲ھ کو سڑک عبور کرتے ہوئے مولانا ایک سیکل سے متصادم ہو گئے۔ اس حادثے سے آپکے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپ کو اٹھا لیا گیا۔ مقامی جراح کا علاج رہا لیکن ہڈی جم نہ سکی بالآخر چھ ماہ کے بعد آپ کو دواخانہ رجوع کیا گیا جہاں آپ کا آپریشن کر کے شکستہ ہڈی کو دھات کے ٹکڑوں سے پیوست کیا گیا۔ دورانِ آپریشن اور بعد بھی سرجن سے لے کر وارڈ بوائے تک اس مجسمۂ صبر کے مظاہرۂ صبر پر متحیر نظر آرہے تھے۔ ان کو کیا معلوم کہ خاصانِ خدا، مقام تسلیم و رضا پر جرأتِ آہ کو بھی آئینِ بندگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ وہاں تو ع

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

کا انداز کارفرما تھا۔ ایک ہفتہ بعد ہی اسپتال کے اجنبی ماحول سے مولانا کا جی اکتا گیا اور بہ اصرار تمام مکان پر واپس آ گئے۔ ایک سال اکادن دن کی طویل علالت نے آپ کو جزو بستر بنا دیا تھا ـــــ گردن سے پیر تک زخم [BED SORES] پڑ گئے تھے۔ بے حرکتی نے کیا کیا اذیت نہ پہنچائی لیکن تیمارداروں نے کبھی آہ تک نہ سنی۔ عیادت کرنے والے جب پوچھتے "مولانا کیا حال ہے؟" تو فرماتے "صرف ذرا نقاہت ہے اور بس!" طویل علالت میں بھی اشاروں سے عبادت جاری رہی اور ذکر سے کبھی غافل نہ پائے گئے۔

بہرحال ۲۶ رشوال ۱۳۹۳ھ روز پنجشنبہ کو جملہ ارکان خاندان کو جمع کیا اور سب سے اپنی کسی زیادتی یا ترش روئی کی معافی چاہی اور کہا کہ "میں شریعت محمدی کا پابند ہوں اور کلمہ پڑھتا ہوں، تم سب گواہ رہو"۔ اس کے بعد اپنے داماد مولوی عبدالمنان صاحب ایم۔ اے [لکچرر انگریزی انوار العلوم کالج] کو یٰسین پڑھنے کا حکم دیا اور حکیم قادری صاحب سے جو مولانا کے معالج

تھے فرمایا کہ: "حکیم صاحب! اب علاج رہنے دیجیئے۔ علاج کا وقت گزر گیا۔ ایک آخری تکلیف آپ کو دیتا ہوں کہ سورۂ مریم پڑھیئے"۔ اس طرح کلام اللہ سنتے ہوئے رات بسر کی ۲۷ر شوال المکرم ۱۳۹۳ھ بروز جمعہ صبح گیارہ بجے کے قریب یہ آفتاب "ردونِ علم و عمل" "افوض امری الی اللہ" کہتے — غروب ہوگیا۔

مولانا کی رحلت سے دنیائے علم و عمل میں فی زمانہ ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ بظاہر اس کے پُر ہوتے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ عالم اور بھی ہوں گے لیکن مولانا سید عبدالباقی شطاری جیسا جامع علوم کے ظہور کے لیے زمانہ کو صدیوں انتظار کرنا پڑے گا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قال اللہ الحی فی کلامہ القدیم: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ
۱۳۹۳ھ

قطعہ سالِ وصال مقبل ایزد افضل العلماء سید عبدالباقی

۱۹۷۳ء

عالم ادیان وابدان نکتہ دانِ بے نظیر — عبدباقی پیشِ واجب شد گریزاں ناگزیر
۱۹۷۳ء — ۱۳۹۳ھ

از دل تا قل معز ظاہر شدہ سالِ وصال — سید عبدالباقی شطاری بہ گلزارِ قدیر
۱۹۷۳ء — ۱۳۹۳ھ

گردِ زمین سرائے اسبابِ معانی معز قادری الملتانی
۱۹۷۳ء

یہ تعزیتی مضمون جو حیات اور سیرت کے چند پہلوؤں کا ترجمان ہے روزنامہ "رہنمائے دکن" کے ہفتہ وار ایڈیشن (جلد ۴۵ شمارہ ۳۲۷ ص)

مورخہ ۷ ر ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ م ۳ر ڈسمبر ۱۹۷۳ء روز دوشنبہ سے لیا گیا ہے جو چھ ہفتوں کی لگاتار کوشش کے باوجود صاحب مضمون کے ہاں سے بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ [افسوس!] یہ میری ذاتی دلچسپی، کوشش، اخبار کے دفتر کے چکر، کتب خانوں کی چھان بین اور تلاش بسیار کے بعد جامعہ عثمانیہ کی لائبریری میں ہاتھ لگا۔ میں مولاناؒ سے ادنیٰ خادم اور طالب علم کی حیثیت سے اس مختصر جامع مضمون کو کتاب میں شامل کر کے "یادیاتی" کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ جن کے متعلق حضرت صفی اورنگ آبادی نے اپنی مخلصانہ تمنا کا اظہار اس شعر میں اس طرح فرمایا ہے ؎

صدوسی سال وہ باقی رہے دنیائے فانی میں
صفی جس نے مری نسبت کہا ہے "یہ قلندر ہے"

بھلا وہ آرزو ہی کیا جو پوری ہو جائے اور پھر آرزو بھی ایک شاعر کی!

جس طرح مذکورہ بالا مضمون اٹھارہ سال پہلے کا تحریر کردہ ہے اسی طرح حضرت صفی مرحوم کے شاگرد اور جانشین استادِ سخن حضرت غلام علی حاوی [م ۵ر مارچ ۱۹۶۹ء] کے دراز عمر قصیدہ کا حال ہے جو ۱۳۵۲ھ میں ساٹھ سال قبل شادی کی تہنیت کے موقع پر لکھا گیا۔ قارئین کرام سے معذرت کے ساتھ یہاں زیبِ اوراق کرتا ہوں کہ وہ مخزنیہ تاثرات کے مضمون کے بعد مدحت اور تہنیت کے اشعار پڑھیں گے۔ اس بے ربطی کو صرف نظر کر کے کلام کی واقعاتی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے گوارا کر لیں کیوں کہ یہ اسی برگزیدہ شخصیت سے متعلق ہے پھر اس یادگار نوشتہ کی حفاظت کا کوئی اور محل نہیں۔ اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ لکھ سکتا ہوں کہ ان کے خاندان کے کسی فرد کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی، نہ دیدہ نہ شنیدہ! چونسٹھ شعروں پر مشتمل طویل قصیدہ کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں تاکہ یہ تاریخی دستاویز باقی، تابندہ اور پائندہ رہے۔ ساٹھ سالہ قدیم قصیدہ قدر دانوں کے لیے نوادرات اور کھدوائیوں میں حاصل

ہونے والے مخطوط سے کم نہیں۔ اس سخن دلنواز کا بیرے ہاتھ آنا غیبی خزانے کی دریافت اور ایک کرشمہ ہے!

مسکراتے ہوئے پھر اس نے کہا مجھ سے خطاب　　نیند سے جاگ کہ اب جاگ گئی ہے تیری قسمت
دیکھ! نوشاہ بنے مولوی عبدالباقی　　جن کی شادی کی زمانے سے تجھے تھی حسرت
وہ ہیں نوشاہ تو پھر کیوں نہ قصیدہ لکھوں　　کیوں دکھائے نہ مری طبع پھر اپنی جودت
ان کی شادی ہے جو ہیں مظہرِ اسرارِ علوم　　ان کی شادی ہے جو ہیں مصدرِ حلم و رافت
حزبِ شطاریہ کے آج جو ہیں فردِ فرید　　اور پھر سیدِ کونین کی ہیں ذرّیت
ان کے اسلاف تھے سب شیخ شیوخ و علماؑ　　ان کے اجداد تھے سب راہ نمائے مِلّت
علمِ معقول میں ان کو یدِ طولیٰ ہے نصیب　　اور منقول پہ حاصل انھیں کافی قدرت
عالم و فاضل و کامل ہیں وہ اپنے فن کے　　باوجود اس کے ذرا بھی نہیں کبر و نخوت
چشمِ بد دور ہے تدریس میں ایسا اعجاز　　اک غبی کو بھی بنا دیں وہ فلاطوں فطنت
علم کا ایک سمندر ہیں بوقتِ تقریر　　اور تقریر میں ہے سحر کی سی خاصیت
نہیں تحریر بھی کچھ آپ کی تقریر سے کم　　دیکھنے سے جسے ظاہر ہو نظر کی وسعت
آپ کی فکر رسا حلِّ دقائق کی کلید　　آپ کا ذہنِ صفا کوہ شگافِ دقّت
آپ کی ذات میں کیوں جمع نہ ہو خیرِ کثیر　　صادق آیا ہے یہیں آیۂ یُؤتِی الْحِکْمَۃَ
آپ کے واسطے ہوگا کیا اس سے زیادہ اعزاز　　ہے حدیثِ نبوی اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃٌ
طلبِ علم فریضہ ہے ہر اک مسلم کا　ق　اس سے انکار کرے کوئی کہاں یہ طاقت
آج تک آپ اسی فرض کو کرتے تھے ادا　　یعنی گزری ہے اسی شغل میں ہر اک ساعت
جب ہوئی السنہ مشرقیہ کی تکمیل　　امتحانات سے جب آپ نے پائی فرصت
پھر تو شادی کی یہ طے پائی مبارک تقریب　　فرض کے ساتھ ادا ہو گئی گویا سنّت
زندگی کا یہ شریک آپ نے موزوں پایا　ق　افتخارِ نسب و ذی حسب و ذی عفّت
نونہالِ چمنِ مصطفوی وہ بھی ہیں!!　　دودمانِ نبوی سے ہے انھیں بھی نسبت
خوش و خرم رہیں یارب یہ عروس و نوشاہ　　شاملِ حال رہے دونوں کے خیر و برکت
ان پہ ہر دم ہو تری نکتہ نوازی ایسی　　کہ ہر اک لمحہ [illegible]

ان کی ہر ایک تمنائے دلی پوری ہو بخت کو اوج، مقدر کو عطا ہو رفعت
دامنِ عیش پہ آئے نہ کبھی گردِ ملال چھائے عشرت کی فضا پر نہ غبارِ کلفت
متمنی ہوں کہ ہو جائے مشرف بہ قبول
پیش کش ہے جو یہ حمادی کی دلی تہنیت

مورخہ ۲۵ ربیع الآخر ۱۳۵۲ھ یوم جمعہ م ۱۲ مہر ۱۳۴۲ ف۔

ان شعروں میں مدحت ہی نہیں عقیدت بھی ہے اور اظہار حقیقت بھی! میری دانست میں "کھوئے ہوؤں کی جستجو" ایک تہذیبی عمل ہے۔ اگر ہم اپنے ماضی کو فراموش کردیں یا اپنی متاعِ گم گشتہ سے بے اعتنائی کو روا رکھیں تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی گود خالی ہو جائے اور ہم اپنی شناخت کھو بیٹھیں! ایسی صورت میں ان کی کھوج اور تحفظ ہماری ذمہ داری ہے ورنہ ہمارے اسلاف کے رُخِ حیات اور ان کے قابلِ قدر کارنامے وقت کی تاریکی میں ڈوب جائیں گے اور ان کا سراغ لگانے والا کوئی نہیں رہے گا۔

اِن جیسی جامع الصفات شخصیتوں کا یہ نمایاں وصف رہا ہے کہ یہ لوگ فطرتاً علم وفن کے سچے شیدائی ہوتے تھے۔ جو بھی چیز حاصل کرتے ان میں بے مثال، منفرد اور امتیازی فضل وکمال کا اعلیٰ پیمانہ موجود ہوتا تھا۔ قدرت انھیں مال کی دولت سے کم لیکن ذہانت و ذکاوت، اسلامی سیرت، فکروبصیرت، صبرواستقامت اور تقویٰ وزُہد کی بے بہا دولت سے نوازتی! تب ہی زمانے کی عظمتیں اور رفعتیں ان کی پابوسی کرتی ہیں۔

باقی نام اللہ کا!

خواجہ معین الدین عزمی

اُڑا لائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

سیّد مُبارزالدّین رفعت

مالک رام

سہ شنبہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۸ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں پشتوں سے دین و دُنیا کا خوشگوار اجتماع چلا آرہا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ عادل شاہی دَور میں بیجاپور پہنچے تھے۔ حضرت سیّد شاہ حبیب اللہ ان کے جدِّ اعلیٰ تھے، جن کا مزار "سونی گنبد" آج بھی بیجاپور میں ان کی برگزیدگی کا نشان موجود ہے۔ بیجاپور کے زوال کے بعد یہ لوگ یہاں سے نکلے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوتے بالآخر حیدر آباد پہنچے۔ جب سے یہی شہر اس خاندان کا ملجا و ماوا بن گیا۔

مبارزالدین رفعت کی ننھیال بھی کچھ کم ممتاز نہیں تھی۔ ان کی والدہ حضرت سیّد محمود مکّیؒ (مکّی میاںؒ۔ م ۵ر محرم ۱۳۳۸ھ) کی صاحبزادی تھیں۔ پشتوں کی روایت کے تحت مدتوں مشرقی علوم اور دینیات خاندان کا طرّۂ امتیاز رہا۔ اس گھرانے میں سب سے پہلے جس شخص نے انگریزی پڑھی، وہ سیّد زین العابدین تھے، جو [illegible] ریاست حیدر آباد میں انجینیر مقرر ہوئے تھے۔ یہی رفعت صاحب کے دادا تھے۔

سیّد زین العابدین کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کا نام سیّد نظام الدین تھا، جو رفعت کے والد تھے۔ وہ ریاست کے محکمۂ جنگلات میں خاصے اہم

عہدے پر فائز تھے، اور رئیسانہ ٹھاٹ سے اپنے عالیشان مکان میں رہتے تھے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہر طرح کی آسائش میسّر تھی۔ معقول تنخواہ تھی۔ خدا نے اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔ غرض نے غمِ دزدو نے غم کالا۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! دورانِ ملازمت میں جن دنوں وہ نظام آباد میں مقیم تھے، وہاں ایک دن ان کی ایک درویش کریم اللہ شاہ[1] رحؒ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ طبیعت پہلے سے زہد و ورع کی طرف مائل تھی اور اپنے خاندانی پس منظر کی بدولت اہل اللہ کی صحبت کے جویا رہتے تھے۔ لہٰذا کریم اللہ شاہ رحؒ کی تلقین نے ان پر خاص اثر کیا، اور یہ ان کے مریدوں میں شامل ہوگئے۔ اس سے ان کی سلامت روی کی روش اور راسخ ہوگئی۔

اتفاق دیکھئے! اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ان کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ سید نظام الدین کے افسرِ اعلیٰ کو کسی زمیندار نے رشوت دی کہ وہ ایک غریب کسان کی تھوڑی سی زمین کا داخل خارج اس کے نام کردیں، تاکہ ان کی جائیداد کا کھانچا پورا ہوجائے۔ افسرِ اعلیٰ کے لیے اس وقت تک کوئی اقدام ممکن نہ تھا جب تک نیچے سے سید نظام الدین اس زمیندار کے حق میں اور اس کسان کے خلاف اپنی رپورٹ لکھ کر مناسب تجویز نہ پیش کریں۔ چنانچہ افسر مذکور نے ان سے یہ رپورٹ لکھنے کو کہا۔ سید نظام الدین پر خشیّتُ اللہ کا رنگ چڑھ چکا تھا، اس کے ہوتے ہوئے بھلا وہ اس صریح بددیانتی کا ارتکاب کیوں کرنے لگے تھے! انھوں نے اس ظلم کی تائید کرنے سے انکار کردیا، اور جب افسر نے زیادہ اصرار کیا، تو انھوں نے ملازمت ہی سے استعفا دے دیا، اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر حیدرآباد چلے آئے۔

اب انھوں نے تجارت کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنایا، مرشد نے بھی یہی مشورہ دیا کہ تجارت سنّت ہے۔ چنانچہ سید نظام الدین نے اپنی بہت سی جائیداد فروخت

---

[1] روایت ہے کہ کریم اللہ شاہ سکھ سے مسلمان ہوئے تھے اسکے بعد اتنی عبادت اور ریاضت کی کہ برگزیدگانِ الٰہی میں شمار ہونے لگے

کر دی اور اس روپے سے "اقبال برادرس" کے نام سے ایک کمپنی قائم کی، جو ٹھیکیداری کا کام کرتی تھی اور اس میں مکانوں کی تعمیر بھی شامل تھی۔ خدا کے فضل اور سید نظام الدین کی دیانت داری اور اخلاص کی بدولت یہ تجربہ کامیاب رہا۔ اور اس کمپنی نے خوب کمایا۔ سید نظام الدین کا ۳۱ر ڈسمبر ۱۹۳۹ء کو اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ ان کے خاندان کے لیے دورِ ابتلا کا آغاز ثابت ہوا۔ مرحوم نے کنبہ پروری کے خیال سے خاندان کے بہت سے اصحاب کو کمپنی میں شامل کر لیا تھا۔ ان کی وفات پر ان لوگوں نے پورے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور مرحوم کے بیوی بچوں کو ایک حبّہ تک نہ دیا۔

مبارز الدین کا بچپن اپنے والد کے پاس گزرا۔ چونکہ وہ محکمۂ جنگلات میں ملازم تھے، اس لیے ان کا بیشتر وقت دوروں میں کٹتا تھا، مبارز الدین بھی ان کے ساتھ رہتے۔ لامحالہ ایسے ماحول میں ان کی تعلیم میں باقاعدگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ جب والد کو فرصت ہوتی، تو ان سے کچھ پڑھ لیتے، لیکن وہ بھی اپنے فرائضِ منصبی سے مجبور، پوری توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ مبارز الدین کے ایک ماموں سید محمد صدیق رمزؔ محمودی (۱۹۰۰ء ــ ۱۹۶۵ء) پربھنی (ریاست حیدرآباد) کے سرکاری اسکول میں مدرس تھے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے بہنوئی سے ملنے کو آئے انھوں نے دیکھا کہ بچے کی تعلیم خراب ہو رہی ہے؛ وہ سید نظام الدین کی اجازت سے بھانجے کو اپنے ساتھ پربھنی لے گئے، اور گھر پر خود ہی انھیں پڑھانے لگے۔

یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے، جب مبارز الدین کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ سال بھر میں انہوں نے اتنی استعداد پیدا کر لی کہ ماموں نے انھیں اپنے ہی اسکول کے چھٹے درجے میں داخلہ دلوا دیا۔ جب سال کے آخر میں انھوں نے اس درجے کا امتحان پاس کر لیا تو اب حیدرآباد چلے آئے۔ یہاں بھی کئی اسکول بدلے اور آخر کار ۱۹۳۶ء میں دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد وہ جامعہ عثمانیہ پہنچے۔ یہیں وہ بی اے کے طالب علم تھے، جب ان کے والد سید نظام الدین کا ۱۹۳۹ء میں انتقال ہو گیا۔ ان سے چھوٹے تین بھائی اور دو بہنیں اور تھیں، سب سے چھوٹے بھائی کی عمر اس وقت صرف

نو مہینے کی تھی۔ اس پورے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری رفعت کے کمزور کندھوں پر آپڑی۔ "اقبال برادرس" کی تجارت سے جو آمدنی ہوتی تھی، وہ بند ہوگئی، اور خود طالب علم تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غریب کے دل پر کیا گزرتی ہوگی! بہرحال انھوں نے تعلیم جاری رکھی۔ کچھ جائیداد فروخت کردی اور تنگی ترشی سے گزر بسر ہوتی رہی۔

انھوں نے ۱۹۴۳ء میں ام اے (فارسی) کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد وہ پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے، لیکن اپنے نگراں کے عدم تعاون، بلکہ عدم توجہی کے باعث ڈیڑھ برس اس میں ضائع کرنے کے بعد بھی کوئی قابلِ لحاظ پیشرفت نہ ہوتی، تو اس بھاری پتھر کو چوم کے چھوڑ دیا، اور وہیں ۱۹۴۵ء میں جامعہ عثمانیہ کے ملحقہ سٹی کالج میں فارسی کے مدرس مقرر ہوگئے۔ اگلے برس (ستمبر ۱۹۴۶ء میں) اسی عہدے پر اورنگ آباد کالج تبادلہ ہوگیا۔ وہ ۱۹۵۴ء تک آٹھ برس یہاں رہے اورنگ آباد کے قیام کے دوران میں انھوں نے ۱۹۵۰ء میں جامعہ ناگپور سے ام اے اردو کی سند لی۔ اورنگ آباد کے بعد وہ گورنمنٹ کالج، گلبرگہ[1] (حال ریاست کرناٹک) میں اُردو اور فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ قیام گلبرگہ کے زمانہ میں آستانۂ حضرت گیسو دراز بندہ نواز سے شائع ہونے والے "ماہنامہ شہباز" کے نگران بھی رہے۔ وہ گلبرگہ میں ۹ برس (۱۹۵۴ء-۱۹۶۳ء) اور پھر مہارانی کالج، میسور کی پرنسپلی پر دس برس فائز رہنے کے بعد بعمر ۵۵ سال ۱۹۷۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد بھی وہ میسور ہی میں مقیم رہے۔

رفعت کو لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا۔ انوار العلوم

---

[1] لطیفہ یہ ہے کہ گلبرگہ گورنمنٹ کالج کی عمارت ان کے دادا سید زین العابدین نے بنوائی تھی، جب وہ ریاست کے انجینیر تھے۔ رفعت بڑی مسرت سے کہا کرتے تھے کہ دادا جان کو کیا معلوم تھا کہ آج جو عمارت میں تعمیر کر رہا ہوں، ایکدن میرا پوتا اسی جگہ آکر پڑھائے گا۔

ہائی اسکول کے دَور میں وہ اس کے قلمی میگزین کے اور پھر سٹی کالج کے میگزین "المُوسیٰ" کے اور اخیر میں مجلّۂ عثمانیہ کے ایڈیٹر رہے۔ وطن سے باہر ان کا سب سے پہلا مضمون معاشیات پر "ابنِ خلدون کے خیالات" معارف (جولائی، اگست ۱۹۳۷ء) میں چھپا، جب ان کی عمر صرف ۱۸، ۱۹ برس کی تھی، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اس سے ظاہر ہے کہ ان کی خداداد صلاحیت کس پایہ کی تھی۔ ان کی کوئی [۳۰] کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں تصنیفات، تالیفات، تراجم شامل ہیں انھیں ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس باب میں ان کی دو کتابیں: فلپ حتّی کی "عرب اور اسلام" انگریزی سے، اور "تاریخ ادبیاتِ ایران" از رضا زادہ شفق فارسی سے، بہت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۵ء میں اس کتاب کا نواں ایڈیشن شائع کیا۔ کتابوں کے علاوہ ان کے مضامین کی بھی خاصی تعداد رسالوں میں منتشر پڑی ہے۔ وہ ابھی ایم اے کے طالب علم تھے کہ ان کی شادی ہوگئی۔ ان کی بیوی مبین النسا بیگم میر حسین علی مرحوم (ف ۱۷ اگست ۱۹۷۶ء) سابق نائب معتمد تعلیمات کی صاحبزادی ہیں۔ ان کا عرف اقبال سلطانہ تھا، اور بالعموم انھیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ رفعت بھی خود ان کا عرف تھا، تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے۔

صحت شروع میں تو ماشاء اللہ تسلی بخش رہی، لیکن کثرت کار اور سگرٹ نوشی میں بے اعتدالی نے فشارِ دم (بلڈ پریشر) کا عارضہ پیدا کر دیا۔ یہ قیام گلبرگہ کے اوائل یعنی ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۷۲ء میں جسم کے بائیں حصّہ پر فالج کا حملہ ہوا۔ بارے دوا دوش سے افاقہ ہوگیا، لیکن سچ ہے یہ کہ اس کے بعد پوری صحت کا ایک دن نصیب نہ ہوا۔ جمعہ ۱۸ر جون ۱۹۷۶ء نصف شب کے چند منٹ بعد اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے میسور میں انتقال ہوا۔ وہیں اگلے دن (ہفتہ) بعد نمازِ عشاء بنی ہشّپ کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

اِسلامیات

۱: معاشیات پر ابن خلدون کے خیالات ، معارف جلد ۴۰ (جولائی ۳۷ء)
ص ۱۶ - ۲۸ و [اگست ۱۹۳۷ء] ص ۸۵ - ۹۵

۲: مقالاتِ جمال الدین افغانی (فارسی] : حیدرآباد - ادارہ اشاعت
سیاسیہ - ۱۹۴۵ء

۳: مقالاتِ جمال الدین افغانی (عربی) حیدرآباد - نفیس اکیڈیمی - ۱۹۴۶ء

۴: مقامِ جمال الدین افغانی - حیدرآباد - نفیس اکیڈیمی - ۱۹۴۶ء طبع دوم
کراچی - نفیس اکیڈیمی - ۱۹۵۳ء

۵: عرب اور اسلام از فلپ خوری حتّی - دہلی - ندوۃ المصنفین ۱۹۵۰ء

۶: اسلامی فنِ تعمیر از ارنسٹ رچمنڈ - علیگڈھ - انجمن ترقی اردو ۱۹۵۲ء

ادبیات اُردو

۷: دامنِ تہی [افسانوں کا مجموعہ] - حیدرآباد - ادارہ دانش و حکمت ۱۹۴۵ء

۸: سید سجاد حیدر یلدرم - حیدرآباد - اِدارہ ادبیات اردو - ۱۹۴۶ء

۹: پرتگالی راہبہ کے خطوط محبت - حیدرآباد - ادارہ دانش و حکمت ۱۹۴۶ء

۱۰: تاریخ ادبیاتِ ایران - از رضا زادہ شفق - دہلی - ندوۃ المصنفین - ۱۹۵۰ء
اسی ادارہ کی جانب سے اس کتاب کی نویں مرتبہ اشاعت عمل میں آئی -

۱۱: مسدس مدو جزر اسلام کے تین جواب - کراچی " اردو " انجمن ترقی اردو
پاکستان - ۱۹۵۹ء

۱۲: مقامِ غالب (طلبہ کے لیے غالب کی زندگی اور تصانیف کا تعارف)
حیدرآباد . ادارہ ادبیات اردو ۱۹۶۱ء

۱۳: بابائے اُردو - " اردو " (بابائے اردو نمبر) ۱۹۶۲ء

۱۴: پگڈنڈی - یلدرم نمبر - امرتسر - ۱۹۶۲ء

۱۵: انتخاب کلام صفی اورنگ آبادی۔ حیدرآباد۔ اعجاز پریس۔ ۱۹۶۳ء

دکنیات

۱۶: حدیقۃ العالم اور اس کا مصنف۔ دکن ہسٹری کانفرنس پروسیڈنگس۔ ص ۴۱۷ - ۴۲۷ - حیدرآباد ۱۹۴۵ء

۱۷: سالار جنگ میوزیم۔ حیدرآباد۔ سالار جنگ میوزیم کمیٹی۔ ۱۹۵۷ء

۱۸: پن چکی اورنگ آباد اور اس کی تاریخ۔ حیدرآباد۔ ادارۂ ادبیات اردو۔ ۱۹۵۷ء

۱۹: حیدرآباد کی تعریف میں فارسی مثنوی معانی۔ حیدرآباد۔ ادارہ ادبیات اردو ۱۹۶۰ء

۲۰: کلیات شاہی۔ علی عادل شاہ ثانی کا کلام۔ علیگڈھ۔ انجمن ترقی اردو۔ ۱۹۶۲ء

۲۱: شکارنامہ از حضرت خواجہ بندہ نواز۔ حیدرآباد۔ اردو اکیڈیمی۔ ۱۹۶۲ء

۲۲: دکنی ادب کا ایک عظیم مرکز "بیجاپور" مجلہ عثمانیہ جلد ۵ ۶ (دکنی ادب نمبر ۱۹۶۳ - ۶۴)

۲۳: قدیم اردو پر ایک نظر۔ نوائے ادب۔ جنوری ۱۹۶۷ء

۲۴: ابلیس نامہ از علاء الدین فقیر۔ قدیم اردو۔ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ جلد دوم۔ ۱۹۶۷ء

۲۵: سلیمان خطیب اور ان کا کلام مع انتخاب۔ دھنک۔ بنگلور۔ اردو لائبریری سنٹر۔ ۱۹۶۹ء

۲۶: تبصرۃ الخوارقات از سید حسن اللہ بن سید علی اللہ محمد الحسینی۔ کرامات و واقعات بندہ نواز۔ بہ تصحیح و ترجمہ و مقدمہ۔ حیدرآباد۔ اعجاز پریس۔ ۱۹۷۷ء

متفرقات

۲۷: ہماری غذا۔ حیدرآباد۔ انجمن ترقی اردو۔ ۱۹۴۱ء

۲۸: مشاہیر کی بیویاں۔ حصہ اول و حصہ دوم۔ حیدرآباد۔ ادارۂ اشاعت سیاسیہ ۱۹۴۴ء - ۴۵ء

۲۹: مختصر تاریخ تمدن۔ دہلی۔ انجمن ترقی اردو۔ ۱۹۴۴ء

۳۰: پیٹ کی ماری روپ متی۔ حیدرآباد۔ ادارۂ ادبستان اردو۔ ۱۹۴۶ء

۳۱: عرب کا خلیفہ اور ہندوستان کی شہزادی ۔ حیدرآباد عبدالحق اکیڈیمی ۱۹۴۶ء
۳۲: ایک مشرقی کتب خانہ ازدی ۔سی، اسکاٹ اوکانر ۔علیگڈھ انجمن ترقی اُردو ۱۹۵۱ء

غیر مطبوعہ

۱: تاریخ محمد قطب شاہی (فارسی)
۲: مقدمہ آثار الوزرا [ام ۔ اے کا مقالہ]
۳: ہندوستانی مصوّری

مذکورہ مطبوعات کی طویل فہرست مالک رام صاحب محترم کے مضمون میں شامل نہیں ہے بلکہ یہ اس کتاب کے مرتب نے لکھی ہے۔ بقول جناب نثار احمد فاروقی صاحب "اس طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ اس میں مختلف فنون اور مفید علمی موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے اور جن حضرات نے ان میں سے کچھ کتابیں پڑھی ہوں گی وہ بھی یہ اقرار کریں گے کہ رفعت صاحب کو ترجمہ کرنے کا سلیقہ خداداد ہے۔ وہ ایسی ہنرمندی اور چابکدستی سے دوسری زبان کے مفہوم کو اپنی عبارت میں منتقل کرتے ہیں کہ ترجمے کا جو حق ہے ادا ہوجاتا ہے"۔

"ساتھ ہی میں اس بات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اتنے مختلف متنوع اور مفید مضامین پر کتابوں کی تالیف وتراجم کے بعد بھی رفعت صاحب کی علمی خدمات کا کما حقہٗ اعتراف نہیں کیا گیا"۔ [یگڈنڈی : یلدرم نمبر ۱۹۶۱ء]

LEGECY OF ISLAM EDITED BY T.M. ARNOLD – [OXFORD, 1931] ۔ کے درج ذیل مضامین (۱): مغربی فن تعمیر پر اسلامی فن تعمیر کے اثرات [برہان جلد ۲۸، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۲ء] (۲): اسلامی صنائع لطیفہ اور یورپی صنائع پر ان کا اثر [برہان جلد: ۳۶ شمارہ ۲، ۳، ۴، ۵ سنہ ۱۹۵۶ء] (۳): اسلامی فن کے یورپی مصوری پر اثرات کے زیرِ عنوان رفعت محترم نے اردو میں منتقل کیا اور باقی مضامین کا ترجمہ

ان کے بہنوئی اور علمی دوست ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی نے کیا۔
عبدالمجید سالک، پاکستانی ادیب نے ان دو مترجمین کی حق تلفی کر کے جملہ مضامین اپنے نام سے "میراث اسلام" کے عنوان لاہور سے شائع کر لی۔ ان واقعہ کے بارے میں ڈاکٹر خالدی فرماتے ہیں: "ابوالنصر کو فرصت ہی نہیں ملی کہ سالک صاحب سے اس بارے میں بات کرتا اور رفعت میاں نے اپنی شان سے بالاتر سمجھا کہ کچھ پوچھ گوچھ کریں" کراچی میں واقع حیدرآباد یوں کا قائم کردہ ناشر کاروانِ ادب نے ۱۹۵۲ء میں "عظمت اسلام" کے عنوان ان مضامین کو اکٹھا کیا، مگر نامعلوم وجوہات کی بناء پر ڈاکٹر خالدی مرحوم کو اشاعت سے مطلع نہیں کیا۔ (مرتب)

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تم سا کہیں جسے

ادبی شخصیتوں کے چند خطوط رفعت محترم کے نام

خواجہ معین الدین عزمی

رفعت محترم کو مرحوم لکھتے ہوئے دل میں ایک پھانس کی چبھن سی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی بھی ادیب یا فنکار موت کی آغوش میں ضرور ابدی نیند سو جاتا ہے لیکن وہ فنا نہیں ہوتا۔ اس کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارنامے اور فنی شہ پارے نام اور کام کو زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح رفعت محترم بھی اپنی کتابوں کے سدا بہار گلستان میں زندہ اور تابندہ ہیں۔ انھیں ڈھونڈنا ہو تو ان کی تصانیف میں ڈھونڈ یئے، ان کتابوں کے بے نظیر ترجموں میں تلاش کیجیے جن پر تراجم کی بجائے تصانیف کا گماں ہوتا ہے چاہے وہ انگریزی زبان و ادب سے کیا گیا ہو یا فارسی کی تاریخی، علمی اور ادبی شہ پاروں کو اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہو۔ ان کے ترجمہ کرنے کی خداداد صلاحیت نے ان کے اس فنِ حسنِ کمال و خوبی کا لوہا منوایا تھا جو ان کی زبان دانی میں مہارت اور قدرتِ بیان پر دلالت کرتا ہے۔

ان کی استادانہ خوبیوں کو اُن درس گاہوں کے در و دیوار سے پوچھیے جہاں اردو اور فارسی زبان و ادب کی تاریخ، نصابی کتب اور شعر و سخن کی تدریس و تفہیم شُستہ و شیریں زبانِ اردو میں دلنشین انداز اور دلکش پیرایۂ بیان میں طالب علموں کے ذہن نشین کرائی جاتی تھی۔ چاہے وہ سٹی کالج [حیدرآباد] کے لکچر ہال ہوں یا اورنگ آباد کالج کے طاق و ایوان ہوں، گلبرگہ کالج کی تدریسی جماعتیں ہوں یا مہارانی کالج میسور کے وسیع اور کشادہ کمرے! طالب علموں کی درخشاں ذہانت اور ابھرتی زندگی گواہی دے گی کہ وہ کیسے ہمدرد شفیق

اور حرّبی استاد کی تعلیم و تربیت میں پروان چڑھتے رہے۔ ان کی رہنمائی اور نگرانی میں تحقیق کرنے والے دماغ شہادت دیں گے کہ کیسے سند افتخار حاصل کرکے ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کیا۔ یوں تو استاد بہت ہوتے ہیں لیکن پدرانہ شفقت، بے لوث اخلاص و محبت کی دولت لٹا کر دلوں کو فتح کرنے والی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ان کی بے غرض دوستی اور بے پایاں خلوص کو ان احباب اور رفقاء کے قلوب سے پوچھیے کہ جب ان کا ذکر آجاتا ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور دل سنبھالے نہیں سنبھلتا! انھیں آپ یہ کہتے سنیں گے کہ آئی رفعت کی یاد تو آنسو نکل پڑے!!

رفعت محترم نہایت خلیق، ملنسار اور شیریں گفتار تھے۔ ان جیسی سادہ لوح، ہر دلعزیز، باوقار، نیک سیرت، منکسر المزاج شخصیت کے جادو سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ جو کوئی ان سے ایک بار ملتا تو ان کی دلفریب گفت وگو اور خوش اخلاقی کا ایسا گرویدہ ہو جاتا کہ پھر ملنے کی تڑپ اور حسرت دل میں موجزن رہتی۔ اکثر حضرات سے دوستی، محبت، اخلاص و مودّت اس قدر بڑھا کر اسے قابلِ رشک دوستی کی معراج یا عشق کے درجہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

مجھے ان کی شخصیت پر کوئی تفصیلی اور پُر مغز مضمون لکھنا مقصود نہیں ہے اور نہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل پاتا ہوں۔ ان کی وفات کے بعد ادبی رسالوں نے "رفعت نمبر" شائع کئے۔ ان پر مضامین پڑھے گئے مقالے لکھے گئے لیکن انھوں نے اردو زبان، اس کی تاریخ اور علم و ادب کی جتنی طویل عرصے تک وسیع اور وقیع خدمات انجام دی ہیں ان کا بجا طور پر اعتراف نہیں کیا گیا اور صحیح معنی میں حق شناسی نہیں کی گئی۔ گو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جناب حشمت فاتحہ خوانی ام۔ اے [ساکن گلبرگہ] غالباً ۱۹۸۸ء سے رفعت محترم پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ کام اب تک مکمل بھی ہو گیا ہو۔ اس کے باوصف اردو ادب میں ان کی "کوہ کنی" کو تسلیم کرتے

ہوئے جس مقام و مرتبہ کے وہ مستحق تھے ان کو وہ عظمت اور رفعت آج تک نہیں ملی۔ وہ ایک بڑے اہلِ قلم تھے، قابلِ قدر مترجم تھے۔ انھیں فارسی اور اردو زبان پر بے پناہ عبور حاصل تھا۔ ان کی تصانیف، تالیفات اور تراجم سے ادبی دنیا ناواقف نہیں ہے۔ ایک خام اندازے کے مطابق آپ کے لگ بھگ دو سو سے زائد مضامین، تحقیقی مقالے اور ترجمے ہندو پاک کے مختلف معیاری اخباروں، جریدوں اور رسالوں کی زیب و زینت میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کے وقار کو بھی بلند کیا۔ اگر ان منتشر اور پھیلے ہوئے مضامین کو اکٹھا کر کے جستہ جستہ کتابی شکل میں مرتب و مدون کیا جائے تو یہ زبان و ادب کی عظیم خدمت ہوگی۔ اس سے نہ صرف محققین کو تاریخی، علمی اور ادبی مواد یکجا مل جائے گا بلکہ تشنہ لب اہلِ ذوق کی تسکین کا بھی باعث ہوگا۔ کاش کوئی ادبی انجمن یا اردو کا ادارہ اس کام کی جانب توجہ کرتا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ایک ادیب کی تحریریں قومی سرمایہ ہوتی ہیں۔ ادیب اپنی تخلیقات سے تہذیب و تمدن کے دامن میں وسعت پیدا کرتا ہے اور اس دامن کو اپنے تحقیقی اور تحریری نگارشات کے چاند ستاروں سے مزین کرتا ہے۔ رفعت محترم کی تخلیقات اور تراجم کا شمار بھی ادبی شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے دور کی عہد آفریں شخصیت تھے جنھیں فراموش کر دیا گیا۔

میں یہاں ان کے چند شاگردوں، علمی اور ادبی سر برآوردہ شخصیتوں کے خطوط پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو رفعت محترم کے نام لکھے گئے تھے کاش ان کے جوابی مکتوبات بھی فراہم ہو جاتے تو مطالعہ کا لطف دوبالا ہو جاتا! انھوں نے "اجتماعی ماہی گیری" کی اور نہ "انفرادی صید افگنی" بلکہ ان کی ادبی خدمات نے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، مصنفوں، صحافیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ آپ کے نام لکھے گئے خطوط کی تعداد چار ہندسوں میں تو ضرور ہوگی جن میں طلباء، اساتذہ، محققین، شعراء، ادیب، ہمعصر بزرگ، اہل قلم اہلِ فکر و نظر، ناشر، قلمی دوست، جگری دوست اور دیگر استفادہ کنندگان

کی ایک طویل فہرست ہو گی۔ ظاہر ہے سبھی خطوط قابل اشاعت اور علمی افادہ کے حامل نہیں ہوتے۔ ان ڈھیروں خطوط میں سے کام کے خطوط کا چننا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں! یہ مشقت جھیلی گئی۔ ان خطوط کی فراہمی کے لیے میں ان کی اہلیہ محترمہ اور فرزند اکبر ڈاکٹر سید نظام الدین اسد صاحب کا تہہ دل سے سپاس گزار ہوں۔ اگر یہ ہمدست نہ ہوتے تو میں انھیں اہل ذوق قارئین اکرام کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل نہ ہوتا۔ ہر فرد کا ایک ایک خط بھی منتخب کر کے پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک ضخیم کتاب سے کم نہ ہو گی۔ یہاں دستیاب شدہ چند خطوط ہدیۂ ناظرین ہیں۔ شخصیتوں کے مراتب و مقام کے اعتبار سے اور تاریخ داری ترتیب کا لحاظ رکھا جانا امر محال ہے۔ اس لیے ناموں کی تقدیم و تاخیر کسی شخصیت کے لیے بار خاطر گزرے تو معذرت خواہ ہوں۔

ہماری علمی زندگی میں خطوط کی تاریخی اور ادبی افادیت کے لحاظ سے اہمیت ہوتی ہے۔ ان خطوط سے اس دور کی ادبی فضا کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے قطع نظر کسی انسان کی اصلی شخصیت وہی ہے جس سے اس کے گرد و پیش کے انسان آگاہ ہوں چاہے وہ دور کے رہنے والے ہوں یا قریب کے! یہ چند صفحات خود اپنی شرح ہیں۔ ایک چھوٹا سا آئینہ خانہ ہے جس میں شخصیت کے اہم گوشوں کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کاغذی پیرہن میں زندگی کے کچھ ایسے نقوش بھی نظر آئیں گے جس میں حکایتیں بھی ہیں شکایتیں بھی! گلے بھی ہیں سپاس گزاری بھی، زندگی کی تلخیاں بھی ملیں گی اور کارناموں کی جھلک بھی! غم جاناں بھی ہے غم روزگار بھی!

خطوط کیا ہیں؟ جوئے کہستان کی آب رواں ہے۔ اگر کوئی اپنی تنہائی میں لطف انجمن کا خواہاں ہو تو ان کی سیر کر لے، سب کچھ ملے گا مگر اپنے ظرف و چاہت کے مطابق۔ یہ وہ بادہ ہے جس میں تلخئ مے بھی ہے اور سرور کی چاشنی بھی! شاید اس سے پیاس نہ بجھے اور تشنگی باقی رہے! خطوط حاضر ہیں۔ یار زندہ صحبت باقی!

اخبار "صدق" دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی مورخہ ۱۴ر مارچ ۱۹۴۴ء

عزیز مکرم سلمہ اللہ۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ
مضامین "سچ" و "صدق" سے انتخابات و اشاعت کی اجازت میری طرف سے بہ مسرت تمام ہر وقت ہے۔ مقصود اشاعت ہے نہ کہ تجارت۔ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ۔ آپ خود جب کبھی بھی آمادہ ہوں، اشتراک عمل کے لیے حاضر ہوں۔

شروانیہ مرحومہ کی نظمیں بہت عرصہ ہوا بعض رسالوں میں پڑھی تھیں اور اس وقت پسند آئی تھیں۔ اب اگر مجموعہ کہیں نظر سے گزرے تو زیادہ ذمہ داری کے ساتھ اظہارِ خیال کر سکوں۔ آپ سے ملنا تو حیدر آباد میں یاد پڑتا ہے لیکن آپ کی اور خصوصیات ذہن میں نہیں ہیں۔ آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے۔ اب مشغلہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آئندہ کبھی خط لکھنے کا اتفاق ہو تو یہ چیزیں لکھ بھیجیے گا۔ والسلام

عبدالماجد

کتب خانہ ریاست رامپور ۲۰ر نومبر ۱۹۴۲ء

جناب رفعت صاحب کی خدمت میں سلام کے بعد عرض ہے کہ آپ کے مکرمت نامے کے جواب میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ جس کی معافی چاہتا ہوں۔

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ پٹنہ میں آپ کو خلاف توقع بے مروت انسان ملے۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا، ورنہ میرے ایک دو مخلص وہاں موجود تھے، انھیں لکھ دیتا۔ بہرحال جو کچھ ہوا، اچھا ہوا آپ کو سفر و حضر کے فرق کا تجرباتی علم ہو گیا۔
مسئلہ قیس پر جو کتاب فارسی میں لکھی گئی ہے، اس کا!

"فرہنگ خاور شناساں" اور مصنف کا نام "ابوالقاسم سحاب" ہے۔
یہ کتاب تہران میں ۱۳۱۷ شمسی میں چھپی۔ ملنے کا پتہ: کتاب خانۂ دانش،
کلکتہ یا "ادبستانِ جہاں" پی۔او: وینی، درجھنگ ہے۔

کتاب خانہ پر جو مضمون میں نے لکھا ہے اس کا مسودہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ مسودہ کو احتیاط سے جلد واپس فرمایا جائے اور اپنے مضمون کی ایک کاپی بھی ارسال فرما دیجیے گا۔ آپ تو غالباً اردو میں مضمون لکھیں گے؟ اگر انگریزی میں لکھنے کا خیال ہو تو الفاظ اور پیرایۂ بیان بدل دیجیے گا۔ اور یوں بھی یہ عربی والوں کی انگریزی ہے۔ آپ کو بھلا کیا پسند آئے گی۔

تمام قلمی کتابوں کے لیے لوہے کی الماریاں گوڈریج سے بنوائی گئی ہیں۔ تمام قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی از سرِ نو تجلید کی جارہی ہے اور نئے اصول پر فہرستیں تیار ہو رہی ہیں۔

اس کتاب خانے کے باقاعدہ پہلے ناظم حکیم اجمل خاں مرحوم دہلوی تھے۔ ان کے بعد حافظ احمد علی خاں مصنف "تذکرۂ کاملانِ رامپور"، ان کے بعد مولوی نجم الغنی خاں مصنف "تاریخِ اودھ و رامپور" وغیرہ اور ان کے بعد یہ نیازمند اس عہدے پر فائز ہوا ہے۔

اکبر میاں اور کبریٰ بی آداب عرض کرتے ہیں۔ آپ نے جو کلمات میرے اور میرے احباب کے بارے میں لکھے ہیں، میں انھیں آپ کی شرافت پر محمول کرتا ہوں اور دل سے شکرگزار ہوں۔ والسلام

مخلص

امتیاز علی عرشی
ناظم رضا لائبریری رامپور

[۱] نارائن گوڑہ - حیدرآباد		مورخہ ۲۴ر ڈسمبر ۱۹۴۶ء

مکرمی! تسلیم!

خالدی صاحب سے میں نے دو تین مرتبہ فارسی مجموعہ اقبال کے لیے کہا اور معلوم ہوا کہ انھوں نے آپ کو پیام پہنچا دیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ اورنگ آباد جانے والے تھے۔ پھر اس وقت بھی کہا جب وہ سفر مصر کے تہیہ میں تھے۔ اور حسن اتفاق سے آپ بھی ان دنوں حیدرآباد ہی میں تھے۔ یہ تو یقین تھا کہ آپ کو فرصت نہ ہوگی مگر یہ خیال ضرور تھا کہ اتنی زحمت آپ ضرور گوارا فرمالیں گے کہ کسی کے ہاتھ کتابیں روانہ فرمادیں گے۔ دیوان حافظ غالب اور اقبال میں نے کبھی کسی کو نہیں دیا۔ یہ کتابیں ہمیشہ میرے سرہانے ہی رہیں۔ پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ اقبال کو پڑھنا چاہتا ہوں اور نہیں پڑھ سکتا۔ نہ جانے کتنی مرتبہ اس ہوک سے گزر جانے کے بعد یہ حرف زبان پر آئے کہ مبارز الدین صاحب سے اقبال کے لیے کہہ دیجیے۔

یہ خط اس خیال سے کہ شاید اورنگ آباد کا پتہ جو میں نے لکھا وہ ناکافی ہو، "استاذ" کے توسط بھیج رہا ہوں۔

عاصی

---

[۲]		ابوالخیر (مودودی)

رحمان پورہ ، اچھرا۔ لاہور		مورخہ ۱۵ر ڈسمبر ۵۵ء

جناب رفعت کی خدمت میں بے حد ندامت کے ساتھ بعد سلام عرض ہے کہ "تراث الاسلام" کے دونوں حصے مل گئے۔ میں ایک بیگار میں ماخوذ تھا اس لیے رسید بھی نہ دے سکا۔ بیگار ایسی شدید تھی کہ دو حرف رسید کے بھی نہ لکھ سکا۔

قلب کے دورے بیگاری تو ہیں۔ پہلے کبھی قلب کے دوروں نے اتنا طول نہیں کھینچا تھا اور اتنا آزاد نہیں دیا تھا۔ قوی جواب دے چکے ہیں ایک دورہ بھی کئی دن کو بیکار کر دیتا ہے۔ اور یہاں ترے کو مارے زندہ شاہ مدار، دوروں کا تسلسل رہا۔

نہ جانے آپ نے کتنی صلواتیں دی ہوں گی مگر افتادوں نے صلواتوں کی بھی مراعات نہ کی۔ ایک مصیبت سے مر مر کے جینا ہوا تھا، دوسری مصیبت آدھمکی۔ "داخل فصلیں کو ناتوان جسم ملا، اس نے ناتوانی کا مزہ چکھایا، بخار صاحب براجمان ہو گئے۔ ابھی وہ سدھارے بھی نہ تھے کہ دانتوں نے کہا ہم بھی ہیں اور ہمیں درد ناک بنانے میں ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ ایک نہ دو اکٹھے پانچ دانتوں نے اپنے ملکات کے مظاہرے فرمائے۔ ایک تشریف لے گئے، میں نے شریفانہ رویہ اختیار کر لیا۔ ایک کی خباثت آج کل کی شرافت میں ملفوف ہو گئی۔ معلوم ہوا جناب کو؟ آپ کا یہ نیاز مند بتیس میں گیارہ بارہ دانتوں کا تہمت زدہ رہ گیا ہے۔ سوانح روزگاران بتیاؤں پر سوا! یہ ہے مولانا رحمٰن ورحیم صاحب کی عطا کردہ زندگی! بڑا احسان فرمایا تھا کہ زندگی بخشی۔ ان کا شوقِ تخلیق یکسر حق نہیں کچھ عبث بھی ہے!

لجنتہ الجامعین نے خوب کام کیا ہے۔ یہ آپ کا انجمن طیلسانین کا ظہری بروز ہے۔ ترجمے میں اصل کا پورا عکس منتقل کیا ہے۔ ترجموں کے نوٹ قابل داد ہیں۔ میں کوشش کروں گا عربی ترجموں کے نوٹ اردو ترجمے میں آراستہ ہو جائیں۔

فلسفہ و دینیات والے مقالے کو اگر جناب شطاری صاحب

ملاحظہ فرمالیں اور صاحب مقالہ کے مسامحات پر حاشیے رقم فرمادیں تو خوب ہو "مباحث شرفیہ" کا ترجمہ انھوں نے بہت ہی خوب کیا ہے۔ یہ درخواست اسی کا ایما ہے۔

ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

ابوالخیر (مودودی)

محترم خالدی کے مکتوبات کا اقتباس :-

[۱] "پہلے گرامی نامہ میں ابوالخیر صاحب مودودی کا پتہ تھا۔ اب مکرر حاضر ہے۔ ابوالخیر مودودی۔ کوچہ رگھبیر۔ موہن پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور۔ مغربی پاکستان۔

"کلیات شاہی" پر آپ نے میرے نام کے آگے جو القاب و آداب لکھے ہیں؟ اسی کو کہتے ہیں

OVER STATING THE FACTS MAKES THEM

OVER EMPHASISING A ... یا INVALID-

STATEMENT MAKES IT POINTLESS-

میں نے قینچی لی اور اتنا حصہ کاٹ دیا۔ اب صرف "مدفیضہ" کی خدمت با برکت میں" رہ گیا۔ سادہ بھیجتے تو وہ نسخہ میں محترمی حادی مدفیضہ کی خدمت میں پیش کرتا اور ان کے ملفوظات سے آپ اور میں دونوں استفادہ کرتے۔ اب براہ کرم ایک دوسرا نسخہ لیتے آیئے اور حادی صاحب کی خدمت میں جو مناسب سمجھیں لکھ کر دیجیئے .... والسلام

خالدی

---

[۲] باسمہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۵ دسمبر والا خط مجھے ۷ کو مل گیا۔ اس سے پہلے آپ کو لکھنا چاہتا تھا۔ خط آنے کے بعد تو مزید تحریک ہوئی مگر۔ مگر؟ فرصت نہیں ملی۔ کسی اور سے

لکھواؤں تو میرے تمہارے درمیان دوسرا کیوں ہو؟ کہتے والے اپنے راز ہائے دروں دوسرے انسان سے کیوں کہتے لگیں یفتہ کو رخصت لی۔ اس روز ۹ تا ۲ دو ایک نشست ہوئی۔ صفیؔ مرحوم کا کلام زیرِ غور تھا۔ علاوہ شطاری محترم کے حاوی وجوہر بھی تھے۔ پھر قریشی صاحب بھی رہے۔ عزمی صاحب اور حامد احمد خاں بھی بغرضِ استفادہ شریک رہے۔ دوسرے دن یعنی اتوار کو دو نشستیں پہلے پہر پھر سہ پہر میں ہوئیں۔ صرف الف کی ردیف ختم ہوئی۔ آپ کی یاد تو شاید مجھے تھی لیکن ضرورت سب نے خاص کر قریشی صاحب نے بہت محسوس کی۔ اس ضرورت میں دوسروں کے علاوہ میں بھی شریک رہا۔ اس سلسلہ میں آئندہ گفت وگو ہوگی۔ فی الحال آپ کے سوالات کے جواب ترتیب وار عرض ہیں۔ گزشتہ جمعہ کو رخصت لی تھی۔ پہلے سے حکیم، صابر صاحب سے اورنگ آباد والے، قریشی صاحب کے ذریعہ وعدہ ہو چکا تھا۔ صبح سوا چھ بجے وحید الدین خاں صاحب کی گاڑی میں گیا۔ نبض دکھائی۔ نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُنھوں نے سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا کہا۔ یہ ادا مجھے بہت بھائی۔ کہی وہی بات جو معلوم تھی کہ کمزوری خطرناک حد تک ہے۔ دوا دی، پیسے نہیں لیے اور کہا یہ دوا عارضی ہے۔ میں آپ کے لیے خصوصی دوا عشرہ پندرواڑہ کے بعد بنا دوں گا۔۔۔۔

شفیق الحسن ہاشمی آج تک تو نہیں آئے۔ آئندہ کا حال! اللہ علیم و خبیر ہے۔۔۔ ترے وندرم جانا مبارک ہو۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ فقط والسلام

محمد خالدی

خالدی محترم کے خطوط رفعت مرحوم کے نام بیشتر نہایت طویل اور تفصیلی ہوا کرتے تھے جن میں علمی گفت وگو، کتابوں کے حسن وقبح، شاعری اور ادب کے رموز و نکات، ذاتی تاثرات اور تبصرے، علمی اور تحریری کاموں کی مصروفیت، راز و نیاز اور کبھی کبھی گھریلو مسائل وغیرہ کی باتیں موجود ہوتیں۔ مختصر خطوط میں اپنی خیریت کی اطلاع اور عافیت مطلوب ہوتی یا پھر اپنے گلبرگہ یا اورنگ آباد آنے کی خبر دی جاتی یا انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت۔ ان کی روشنی میں قرابت داری سے زیادہ آپسی گہرے دوستانہ روابط اور ذہنی قربت کا پہلو افزوں تر اور نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ ان دریافت شدہ چند خطوں میں کچھ آب زدہ ہیں اور کچھ کرم خوردہ۔ نقلیں اور اقتباسات پیش ہیں۔

[۳] السلام علیکم ورحمۃ اللہ مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۵۹ء

آپ کا خط ۱۴ر فروری کی شام میں ملا۔ ارادہ تھا کہ ۲۰ر کو یہاں سے چلوں۔ صحت اور مالیہ نے اجازت نہیں دی سوچتا رہا لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا۔ ہر اتوار کو صفی مرحوم کے دیوان پر نظر ثانی ہوتی ہے۔ اب ردیف "ے" چل رہی ہے آپ کی موجودگی یقیناً مفید ہوتی۔ شاید آپ سے ذکر آیا تھا کہ پورے کلام پر محفل میں غور و بحث ہوتی ہے۔ (غور مونث ہے) زیادہ تر زبان و محاورہ پر سر دھننے والے ہیں۔ رعایت لفظی پر واہ واہ ہوتی ہے اور مجھے یہ دماغی یا لسانی شعبدہ گری معلوم ہوتی ہے۔ افہام وتفہیم کے لیے بعض مرتبہ بحث میں گرمی یا حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ گرمی دوسروں میں حرارت مجھ میں! دوسرا مرحلہ جملہ غیر حذف شدہ کلام کو محفل میں سناتا ہے تاکہ سخن شناس اور زبان داں کے پرکھا رک ریت مٹی صاف کرکے صرف جواہر پاروں کو اہل نظر کے سامنے پیش کریں۔

اس سلسلہ میں اپنے خیالات آپ کی غور کے لیے پیش کر رہا ہوں ساتھ ہی چند سوالات کروں گا، براہ کرم بعد غور وحسبِ ضرورت مراجع، ان کے جواب مجھے تحریر فرمائیں۔

قطامی کا (وہی جس کا ایک شعر حتّیٰ کی تاریخ عرب میں نقل ہوا ہے) ایک قصیدہ غرّا عبدالواحد بن الحارث بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ کی مدح میں ہے۔ قبل اسلام طریقہ کے "ترقی پسندوں کی زبان میں" روایتی ..... اس مقام کا ذکر ہے جہاں پہلی مرتبہ "کسی کو" دیکھا تھا اور جہاں شاہد کئی مرتبہ ..... پھر اونٹنی کا کر دی صحرائے بے آب وگیاہ میں محبوب تک پہنچانے کا وسیلہ ہے پھر گریز اور مدح عبدالواحد۔ کل چالیس پر دو بیالیس ابیات ہیں سترھویں بیت ہے ؎

يَمْشِيْنَ رَهْوًا فَلَا الْاَعْجَازُ خَاذِلَةٌ
وَلَا الصُّدُوْرُ عَلَى الْاَعْجَازِ تَتَّكِلُ

وہ دھیرے دھیرے سکون واطمینان سے چل رہی ہیں ..... الخ

Mona Lisa of Leonardo آپ جانتے ہیں کہ اس تصویر کی تشریح پر کئی رسالہ اور کچھ مقالے لکھے گئے ہیں۔ آپ کو شاید مبالغہ معلوم ہو لیکن غور فرمائیں تو واضح ہوگا کہ اس شعر کے لیے ایسے ہی کچھ مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ "باغ وبہار" کو عالمی ادب کے شہ پاروں میں شمار کیا تھا۔ آپ نے اس کا تحقیر آمیز مضحکہ اڑایا ..... مکرر عرض ہے مجھے اپنی چیز کا شعور پرائی چیز سے ہوا۔ شیکسپیر کے کمال سے انگریزوں کو، سنا ہے کہ، جرمنوں نے واقف کرایا۔ اس سے آپ واقف ہیں کہ کارلائل ہی تھا جس نے جرمنوں کو گوئٹے کی عظمت بتائی۔ جرمنوں اور انگریزوں کے ثقافتی

تعلقات میں یہ واقعہ دلچسپ ہیں نا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یار زندہ صحبت باقی (یا زیاد) آپ نے لکھا تھا کہ مجھے لکھنے کی لہر نہیں آتی۔ آپ کی میری مراسلت کی نوعیت ہر طرح قابل پذیرائی ہے۔ لیکن میں اس کو اپنی بدقسمتی نہیں تو اور کیا کہوں کہ مجھے ہر روز آپ کی یاد آتی ہے۔ دن میں یاد آتی ہے تو چلتے پھرتے لکھتے پڑھتے! رات میں یاد آتی ہے تو کتاب ہی نہیں دیکھ سکتا تو قلم کس طرح سنبھالوں؟ بقول میر دل تو شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے لیکن بعد مغرب یا مغرب کے ساتھ ہی شمع دماغ فروزاں ہو جاتی ہے۔ بستر پر پڑا پڑا عالم خیال میں گفت و گو کرلیتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ آپ نے کبھی خط لکھا ہو اور میں نے جلد از جلد کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ مگر اب کی مرتبہ ایسی تاخیر ہوئی کہ شرم آتی ہے۔ کہتے ہیں تلافی نہ ہوسکے تو معافی ہوتی ہے۔ فقط

والسلام

غالدی

السلام علیک وعلیٰ اھلک الصالحین ۵ر نومبر ۱۹۶۲ء

[۴] آپ کا ۳۱ر اکتوبر ۶۲ء کا شقہ کل ہی یعنی دوسری نومبر کو ملا۔ اسد سلمہٗ اس نئے مکان میں بھی آئے تھے۔ اس وقت سرسری طور پر ادھر اُدھر دیکھ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ مکان کی منتقلی سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا پھر اس طرف توجہ نہ ہوسکی۔ زینت ساجدہ محترمہ کا مرتب کیا ہوا کلیات بھی بدست ہو گیا تھا۔ میں ادھر اُدھر سے جستہ جستہ دیکھا۔ محنت انھوں نے بھی بہت کی ہے لیکن آپ کی طرح متن کو مستقیم کرنے کی سعی نہیں کی۔ یہ چیز ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جدید تعلیم اور جدید ماحول کا نقص ہے۔ اس حقیقت تک اُردو کی جدید پود بالکل

نہیں پہنچ سکی۔ . . . آپ نے لکھا ہے کہ بیوی بیمار، بچے بیمار، بیچارہ جمال تو جنم کا روگی، آپ کا منشی جو ٹھہرا۔ یہاں آجاتے تو طبیبوں سے مشورہ ہو جاتا۔ آپ نہیں آ سکے یا نہیں آسکے۔ میری زندگی بھی بے بسی دبے کسی ہی میں گزر رہی ہے لیکن بے حسی بالکل نہیں۔ بے حسی ہوتی تو پھر بے بسی و بے کسی بے معنی۔ آپ کا بھی یہی حال ہے۔ بے حسی قافیہ ملانے لکھ گئے ہیں۔

دکنی الفاظ کی فرہنگ تیار ہو گئی؟ . . . . اس مہینے سے ایک روز کی تنخواہ حفاظت ملک و قوم کے لیے منہا ہو رہی ہے۔ غالباً آپ کے یہاں بھی یہی ہو رہا ہوگا۔ "برہان" ماہ اکتوبر میں اسمتھ صاحب کے ترجمہ کی پہلی قسط شائع ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ آپ نے زائد نسخے طلب کئے ہوں گے۔ رسالہ دوسرے ہی روز ہوائی ڈاک کے ذریعہ ان کے یہاں بھیج دیا گیا۔ جب صاحب موصوف کا خط آئے گا تو انشاء اللہ مطلع کروں گا۔ کل مکتوبہ کا غذات بیاض میں رکھ کر کالج گیا۔ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہوئی اور اس زور کی ہوئی کہ سارا جل تھل ایک ہو گیا۔ ایک بجے بھیگتا ہوا آیا . . . . آپ تو بخوبی جانتے ہیں کہ زبان جاننے کے لیے خواہ طبعی طور پر خواہ کسی طور پر لغت، صرف و نحو جاننا ناگزیر ہے۔ دسویں صدی کے آخر اور پوری گیارھویں صدی کا اردو ادب بیشتر منظوم ہے دکھنیات کی طرف رجوع ہونے کے لیے ان علوم سہ گانہ کے علاوہ عروض کا جاننا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے . . . جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ مثنویوں میں بحر متقارب بہت رائج ہے . . . . علی نامہ، غواصی اور صنعتی کی مثنوی بحر متقارب ہی میں ہے . . . . والسلام

خالدی

رفعت منزل ۔ خیریت آباد (حیدرآباد) مورخہ ۱۹؍اکتوبر ۵۶ء

(۱) عزیزی رفعت صاحب!

مخمس وصول ہوا۔ شکریہ۔ ایک غزل بھی بھیج سکیں تو مزید عنایت ہوگی۔ آپ کی کتاب چھپ گئی ہے۔ آپ کو اس خط کے ساتھ مل جائے گی۔ اب آپ یہاں کن چھٹیوں میں آئیں گے۔ خواجہ بندہ نوازؒ پر ایک مبسوط (علمی انداز میں) مقالہ کئی سو صفحات کا لکھئے ان کے مرشد شاہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی بھی ایک ہندی کتاب اردو رسم خط میں مجھے مِل گئی ہے جس سے اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ "معراج العاشقین" خواجہ بندہ نوازؒ ہی کی کتاب ہوگی ؎

ایں سلسلہ طلائے ناب است ؛ ایں خانہ تمام آفتاب است

اگر آپ ان پر لکھیں تو بجائے خود دکن کے چند بڑے عوامی خدمت گزاروں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ ؏

تازہ خواہی داشتن ایں داغ ہائے سینہ را

ایک بات یہ بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھئے کہ علمی وادبی کام کو ذریعہ آمدنی نہ بنائیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ملازمت اور با عزت ملازمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ کچھ کام تو محض عِلم وفن کی خاطر کیجئے۔ دولت اور عزّت خود بخود ملتی جائے گی اور یہ عارضی چیزیں ہیں۔ دائمی چیز تو کام ہے اور کام خود انعام ہے

فقط

مخلص

سید محی الدین قادری زور

(۲)　عزیز مکرم!　　　　　مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۵۶ء

آپ کا خط اور شاہی کی غزل مل گئی۔ شکریہ۔ آپ کو "پن چکی" کی کتابیں ملیں یا نہیں۔ ٹائیٹل بہت پتلا لگ گیا۔ خواجہ بندہ نواز پر ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے جو بیری "حیات میر محمد مومن" سے دوگنی ہو۔ محنت سے مواد جمع کیجئے۔ اچھا کام ہو جائے گا اور ہم خرما و ہم ثواب۔ رفتارِ کار سے آگاہ کرتے رہیئے۔ کب آ رہے ہیں؟ مخلص

سید محی الدین قادری زور

تلسی باغ۔ سری نگر　　　　۱۶ مارچ ۱۹۲۲ء

(۳)　محب عزیز سلمہ　　　کارڈ مورخہ ۲ مارچ وصول ہوا۔

میں یہاں آنے کے بعد سے متعدد کمیٹیوں میں بے حد مصروف ہوں۔ ۲۱ کو جموں جا رہا ہوں اور پھر واپس آنے کے بعد دلی جاؤں گا۔ اس لیے عجلت میں لکھ رہا ہوں۔ آپ کی علمی، تحقیقی کاوشوں سے بڑی خوشی ہوئی ہے اور باوجود ناسازی مزاج کے آپ جو کام کرتے رہتے ہیں اس کا دلی قدر داں ہوں۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی اردو نظم و نثر کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ اور جب "معراج العاشقین" ان کے نام سے چھپی تو میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے کسی معتقد نے ان کی گفتگو یا فارسی رسالہ کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ مگر یہ محض شبہ ہے۔ اور چوں کہ مولوی عبدالحق اس کو مان چکے ہیں مجھے اس لیے اس کے خلاف کچھ کہنے یا لکھنے کے لیے باضابطہ ثبوت اور دلائل کی ضرورت ہے جو اب تک نہ مل سکا۔ یہی حال "شکار نامہ" "تلاوت الوجود" اور "درالاسرار" کا ہوگا۔ اور جن تین رسائل کا آپ نے سراغ لگایا ہے ان کا شمار ایسے ہی مشتبہ رسائل

میں کروں گا مگر میرے اس ذاتی شبہ کی بناء پر آپ اپنا کام ملتوی نہ فرمائیں۔ یہ بجائے خود ایک اہم اور ضروری کام ہے اور اس سے اُردو کی قدیم ترین نظم ونثر میں اضافہ ہوگا۔

مجھے اس وقت یاد نہیں کہ یہ تین رسالے کہاں موجود ہیں اور اگر کہیں ہیں بھی یا نہیں۔ یہاں تو میں بالکل بے دست وپا اور بے پر و بال ہوں۔ اور محض اس خطے میں اُردو کی خدمت کے لیے اور غریب الوطن مقیم ہوں اور اپنی بساط کے مطابق اُردو کا کام کر رہا ہوں جس کے نتائج کچھ عرصہ بعد ظاہر ہوں گے۔ خُدا کرے کہ میری یہ خدمت مقبول ہو اور خود اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر سید عبداللہ
۱۶ر جولائی ۱۹۶۰ء
[پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور]

مکرمی! آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مدت کے بعد آپ سے یوں مِل کر خوشی ہوئی۔ مجھے پشاور کی وہ کانفرنس اور کانفرنس کے وہ دن، بلکہ آپ کی آمد اور آپ کا مقالہ ـــــ سب کچھ اس طرح یاد ہے گویا کل کی بات ہے۔ اس کے بعد آپ کے مضامین نظر سے گزرتے رہے اور ترجمے بھی دیکھے مگر صورتِ ملاقات اب نکلی اور یہ بھی اتفاقات ہیں بلکہ حسنِ اتفاق!

رشید الدین فضل اللہ کے مکاتیب، رسائل رشید الدین فضل اللہ کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ان کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ اِطلاع آنے پر کتاب آپ کو بھجوادی جائے گی۔ آپ کا مضمون جب بھی تیار ہو بھجوا دیجئے میگزین

میں شائع ہو جائے گا۔

"انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" اردو کا بہت سا کام ہو چکا ہے بلکہ ترجمے کا سارا کام۔ اب نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اگر آپ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب کو براہ راست لکھیں اور میں بھی ان سے ذکر کر دوں تو ممکن ہے آپ سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ آپ کی یاد فرمائی کا شکریہ ہے۔ والسلام

نیازمند

سیّد عبداللہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ ۲۲ر اپریل ۱۹۶۱ء

مکرمی رفعت صاحب۔ تسلیم!

آپ کے کئی خطوں کا جواب مجھ پر قرض ہے۔ آپ سے شرمندہ ہوں۔ حالات آپ کو معلوم ہوتے تو شاید آپ اتنے شاکی نہ ہوتے یا ممکن ہے پھر بھی ہوتے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

.... خیال تھا کہ جنوری تک آپ کی کتاب کی کتابت ہو جائے گی تو کاپیاں آپ کو بھیج دوں گا۔ کیا بتاؤں کس پریشانی میں ہوں آپ کا غم و غصہ بجا ہے۔ مگر حالات کا قصور زیادہ ہے میرا کم۔ اگر یہ معذرت آپ قبول کر سکیں تو بڑا کرم ہوگا اب کتابت جتنی جلد ممکن ہو شروع کرواؤں گا اور آپ کو اطلاع کر دوں گا۔

خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو۔ مخلص

پروفیسر آل احمد سرور

ترقی اُردو بورڈ۔ کراچی ۶ر جولائی ۱۹۶۱ء

مشفقی، تسلیم!

گرامی نامہ مورخہ ۱۹ر جون ۶۱ء پہنچا۔ آپ نے ہمارے جریدے (اردو نامہ) کو پسند فرمایا، اس کی خوشی ہے۔ اگلے شمارے کے لیئے ہم آپ کے مضمون کے منتظر رہیں گے۔ یہ رسالہ

آپ ہی جیسے اہلِ علم حضرات کے تعاون سے چھپ سکتا ہے اور سراسر آپ کی ہمت افزائی کا محتاج ہے۔

ابھی نصف ملاقات ہی میسر آئی ہے۔ مگر پوری ملاقات بھی زندگی کی خوشگوار اُمیدوں میں شامل رہے گی۔ اور انشاء اللہ بر آئے گی۔ مخلص

شان الحق حقی

عزیز احمد۔ کراچی   ۱۶/اپریل ۱۹۶۸ء

[۱]   گرامی محترم، آداب و نیاز!

والا نامے سے سرفراز فرمانے کے لیے شکریہ۔ آپ کی صحت و عافیت کی طرف دھیان لگا رہتا ہے۔ دست بہ دُعا ہوں کہ خدائے تعالیٰ آپ کو پوری طرح سے توانا، تندرست رکھے اور اپنے اس گراں قدر، رفیع مقدار عطیے کو تا دیر سلامت!

سقوط پر منشی صاحب کی بروقت تصنیف کا جعفری صاحب نے بروقت ترجمہ کیا تھا اور بہت سی غلط بیانیوں پر حاشیوں کے اضافے کئے تھے۔ موضوع کی نزاکت کے کارن ڈاک سے نہیں بھیجنا چاہتا ہوں، پھر بھی آپ کوئی قباحت نہیں محسوس فرماتے ہیں کہ وہاں کے حالات کا بہتر اندازہ آپ ہی فرما سکتے ہیں تو ارشاد، فوراً گزرالوں گا۔

کیا مہارانی کالج کے مجلہ کا "میسور میں اردو نمبر" یا اس کا کتابی ایڈیشن مل سکتا ہے، براہِ کرم ایما فرمائیں۔ آتے پر ہو سکتا ہے ڈاکٹر بخاری کے لیے بھی کاپی منگوانی پڑے۔ "کلیات شاہی" اور "نجات نامے" کے آپ کے ایڈیشنوں سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں براہِ کرم ان کے بارے میں فرمائیے تو میں کوئی سلسلہ نکالوں۔ اب آپ کا جی اچھا ہے۔ حکم ہو تو جمع کئے ہوئے رسالے

ملاحظے میں گزرانوں، اگر مطالعہ سے بار نہیں پڑتا ہو۔ احقر
عزیز احمد

عزیز احمد۔ کراچی ۴ر مئی ۱۹۶۸ء

[۲] محترم و معظم آداب و نیاز۔

آج ہی پروفیسر سیال صاحب کے خط سے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ آپ بفضلہ مہارانی کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ خدائے تعالیٰ اپنی رفعت نوازیوں کا دامن اور وسیع فرمائے اور دنیائے علم و ادب کے آپ سے بزرگوں برتروں کو اپنی رفیع مقدار فیض یابیوں سے استفادوں کے موقع تادیر دیتا رہے۔ اُمید ہے یہ خوش گوار تبدیلی آپ کے لیے ادب وغیرہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے اور زیادہ اور بڑے اچھے موقعے لائے گی۔

آپ کے ارشاد "پر خیالستان" سے استفادہ کیا۔ آپ نے اپنے مختصر مقدمے میں یلدرم کی ادبی شخصیت کے متنوع پہلوؤں میں سے کیئوں کو روشن کیا ہے اور یہ خاصے کی چیز ہے۔ پروفیسر سیال صاحب یلدرم پر بھی مقالے مرتب کر رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس مجموعے کے لیے آپ کے مقالے کا خیال فرمائیں جو یلدرم کے ادبی کردار پر سارے نظروں کا جامع ریویو ہو جس پر لازماً یلدرم کے ساتھ ساتھ خود آپ کی فضیلتوں اور آپ کی خاص محبتوں کی گہری چھاپ رہے گی۔

میرے لیے جو خدمت ہو ارشاد۔ اپنی خیر و عافیت سے مسرور فرمائیے گا۔ احقر
عزیز احمد

حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینی سجادہ نشین روضۂ بزرگ گلبرگہ شریف نے
رفعت محترم کے حقیقی ماموں سید محمد صدیق رمز محمودی کے مکۃ معظمہ میں بحالتِ
نماز انتقال کی اطلاع ملنے پر حسب ذیل تعزیتی خط روانہ فرمایا تھا۔

روضہ منورہ بزرگ
گلبرگہ شریف ۲؍اپریل ۱۹۶۵ء

مکرمی جناب رفعت صاحب زاد محبتہٗ
السلام علیکم!

آپ کے ماموں صاحب کے انتقالِ پُر ملال کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ بڑے عالِم تھے اور موصوف کا طریقۂ تعلیم بھی بڑا خاص تھا۔ یہ سچ ہے کہ عالِم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے یقین کیجیے مولانا مرحوم ایسے ہی عالموں میں تھے جس شخص کی موت حالتِ نماز میں واقع ہو اس شخص کے نیک اور صالح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے ..... فقط

دعا گو
سید شاہ محمد حسینی

۴۹ ہاسپٹل روڈ۔ بنگلور مورخہ ۱۳؍اگست ۱۹۶۵ء

مکرم بندہ! تسلیم۔

کل آپ سے جو اچانک ملاقات ہوئی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ "دولت گم شدہ" مل گئی۔ بڑی دیر تک آپ کا خیال آتا رہا اتوار کے دن ۱۰ بجے آپ کو جو زحمت دیا ہوں وہ کچھ ناموزوں معلوم ہوتا ہے کیوں کہ مجھے ۱۰½ بجے وقف آفس میں ایک کیس کے سلسلہ میں جانا ہے۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو آپ ساڑھے بارہ بجے تشریف لائیں اور تناول ماحضر سے ممنون فرمائیں۔ انشاء اللہ

دل بھر کے باتیں ہوں گی۔ فقط

نیاز مند

مقصود علیخاں

[وزیر ریاست میسور کرناٹک]

پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کے مکاتیب:-

شعبہ اردو، مسلم یونی ورسٹی (علیگڈھ) ۸؍جنوری ۱۹۵۵ء

[۱] مکرمی! تسلیم۔

عنایت نامہ مورخہ ۱۷؍ڈسمبر موصول ہوا۔ تاخیر جواب کے لیے عذر خواہ ہوں کہ تعطیلات میں باہر گیا ہوا تھا۔

اردو کی مکمل ببلوگرافی کا کام بہت اہم ہے لیکن یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ کسی مخصوص عہد یا مخطوطات وغیرہ کی مکمل فہرست تیار کریں۔۔۔۔۔

آپ کے مضامین اور تصانیف کو گاہے گاہے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اردو کے سلسلہ میں آپ جو "عزم کو ہکنی" رکھتے ہیں وہ بہت مبارک ہے۔ شرما صاحب سے ملاقات ہو تو میرا آداب کہہ دیجیے۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

مخلص

مسعود حسین

شعبہ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی (حیدرآباد) ۲۴؍فروری ۱۹۶۴ء

[۲] محبی رفعت صاحب۔ تسلیم!

خفتہ و بیدار حالت میں حیدرآباد پہنچا۔ پرسوں سے سوچ رہا تھا کہ شکریہ کے دو لفظ آپ کو لکھ بھیجوں، آج توفیق ہوئی۔ میں آپ سب لوگوں کا ممنون ہوں کہ آپ نے بہت خلوص

سے میری پذیرائی کی۔ اپنے شعبہ کے رفیق، راہی صاحب اور سلیمان خطیب
صاحب تک خاص طور پر جذبات تشکر پہنچا دیں کہ ان سب کا
نمک خوار بھی ہو گیا ہوں۔ پرنسپل عاقل علی خاں صاحب اور دیگر
رفقائے دعوت و شعر سے ان چند لمحات کی ممنونیت کا اظہار
کرنا جو ان کی معیت میں گزرے۔ آپ ہمہ وقت و ہمہ تن میرے
ساتھ رہے اور آپ کی معیت میں حضرت بندہ نوازؒ کی بارگاہ
تک پہنچا۔ یہ رفاقت اور رسالت کیا کم ہے کہ آپ سب چیزوں
سے تائب ہو کر بکریاں چرانے کی سوچ رہے ہیں۔ میں نے اس کا
ذکر یہاں مشترک احباب سے کیا، ہم سب کی رائے ہے کہ اگر
اس راہ سے آپ پیمبری تک پہنچنا چاہتے ہیں تو لیکن پیمبری
کے دروازے تو اب بند ہو چکے ہیں اس لیے بات سمجھ میں نہ آئی!
ایک بار پھر ممنونیت کا اظہار کرتا ہوں اور آرزو مند ہوں
کہ آپ علم و ادب سے اپنی دلچسپی برقرار رکھیں۔

آپ کا مخلص
مسعود حسین

او۔یو۔کیمپس، (حیدرآباد)
۲۴ر اپریل ۶۵ء

[۳]

محب مکرم رفعت صاحب۔ تسلیم!

عنایت نامہ مع "ابلیس نامہ" علاء الدین بکر بذریعہ رجسٹری
موصول ہوا۔ . . . .

"اردوئے قدیم" کے دوسرے شمارے کے لیے جو جنوری
۶۶ء تک شائع ہوگا کوئی دوسرا شاہین زیر دام کیجیے۔

یہ آپ کا بڑا نیک اور دیر آید ارادہ ہے کہ آپ اردو میں
پی۔ایچ۔ڈی کرڈالیں۔ میں تو اس سلسلہ میں آپ کو کئی بار مہمیز لگا
چکا ہوں۔ زندگی میں کسی نیک کام کے لیے دیر نہیں ہوتی۔ اور آپ کی

تو کئی تحقیقی تصانیف ایسی موجود ہیں جن پر میں [اگر بس چلتا!] تو
بلا دریغ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دے دیتا۔ دکنی اردو کا کوئی بھی
نایاب نسخہ منتخب کرلیں اور بس کہئیے ؏
چل رے خامہ بسم اللہ، دیکھئے پھر وہ کیا کر ڈالتا ہے۔ امید
کہ آپ بخیر د عافیت ہوں گے۔ اچھا اجازت دیجئیے۔ مخلص
مسعود حسین

پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کے خطوط:

[۱] برادر مکرم! ۲۰/ اکتوبر ۱۹۶۰ء

تسلیمات۔

معاف فرمائیں کہ آپ کے عنایت نامے کا جواب بہت تاخیر
سے دے رہا ہوں۔ بلدرم پر آپ کا مرتب کیا ہوا نمبر مل گیا ہے
آپ نے بے حد محنت سے جمع کیا ہے۔ خدا اس سعی کو مشکور و
مقبول کرے۔ میں اسے بہت جلد نمبر کی شکل میں شائع کروں
گا اور یہ کوشش بھی ہوگی کہ کتابی صورت میں آسکے مگر اس کا
امکان کم ہے۔
میں آج کل (اور یہ "آج کل" ۷۔۸ سال سے اسی طرح
چل رہی ہے) سخت ذہنی کرب اور اذیت کا شکار ہوں۔ خدا
ہی بہتر جانتا ہے کہ اتنا لکھنے اور پڑھنے کا حوصلہ کہاں سے
آجاتا ہے ورنہ ؏ طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں۔
اسی لیے آپ سے اور بہت دوستوں سے شرمندہ رہتا ہوں۔
میرے سینے میں کاش آپ جھانک کر دیکھ سکیں کہ ؏ گنج کتنے
اب بھی یاں مخفی ہیں ویرانے کی طرح" یہ ایک لق و دق صحرا ہے
اور میں گویا سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ ہانپ کر کسی سائے
کے نیچے بیٹھتا ہوں تو اسے خوشی سے تعبیر کرلیتا ہوں ورنہ

ما خانہ امیدگانِ طلسمیم　　پیغامِ خوش از دیارِ ما نیست

آپ دعا فرمائیے کہ قیدِ حیات اور بندِ غم سے رہائی ملے۔

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

خدا کرے آپ خیریت سے رہیں۔ خوش رہیں، میں ہمیشہ دل سے دعا گو ہوں۔

آپ کا نیاز مند
نثار احمد فاروقی

[۳] میرے شفیق و رفیق۔　　۲۰ر جنوری ۱۹۶۲ء

السلام علیکم!

۱۶ر جنوری کا محبت نامہ ملا۔ آپ کے خلوص نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ واقعی خط پڑھا نہیں جاتا۔ آنکھیں نم ناک ہو جاتی ہیں۔ میرے لیے آپ کیوں فکر کرتے ہیں جب کہ قدرت مجھے اسی حال میں رکھنا چاہتی ہے۔ خدا جانے میں اپنے کن گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔ آپ کی غمگساری سے میری قسمت تو نہیں بدل سکتی نہ یہ دنیا میری خواہش پر چل سکتی ہے

وما کُلّ ما یتمنّی المرءُ یُدرِکُہٗ　÷　تجری الرّیاح بما لاتشتھی السُّفُنُ

آج ہی سید محمد صاحب کا خط بھی آیا ہے انھوں نے بھی آپ کی تشریف آوری کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ تمہارے لیے یہاں کوئی صورت نکالنے کی تدبیر کر رہا ہوں بھائی! ہمارے لیے اب شاید حشر ہی میں کوئی صورت نکل سکے گی۔ دنیا میں تو ایسے ہی چلنے دو۔

میری کتابیں جلد ہی پریس سے آنے والی ہیں آپ کو سب سے پہلے بھیجوں گا۔　　آپکی محبت کا بھکاری۔ نثار احمد فاروقی۔

(۴۳) صدیق مکرم　　　　۲۲؍فروری ۱۹۶۲ء

۱۲؍فروری کے مکتوب کا شکریہ۔ آپ کو کیسے بھول جاؤں گا۔ آپ کی محبت تو میری زندگی کا اندوختہ ہے۔ ہم جہاں بھی رہیں گے اور جس حال میں بھی، ایک دوسرے کے دُعاگو، دعاجو اور عافیت طلب رہیں گے۔ میں آج کل زیادہ پریشان ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان افکار سے نجات دے۔ زندگی کا اب کچھ حوصلہ نہیں ہے مگر جب تک بھی جینا ہے یہ سب کچھ بھی جھیلنا ہے۔ میں نے شکوہ کا دفتر ہی بند کر دیا ہے۔ آپ سے دلی تعلق ہے اس لیے کبھی کبھی کوئی بات قلم سے نکل جاتی ہے جس سے آپ خاصے پریشان ہو جاتے ہیں مگر پریشان ہونا بے سود ہے۔ کوئی کسی کا درد نہیں بانٹ سکتا۔ آپ کا

نثار احمد فاروقی

(۴۴) غمخوارِ جانِ دردمند!　　　　۷؍جون ۱۹۶۲ء

سلام محبت۔

عطوفت نامہ پہنچا اور اس نے میرے ساتھ وہی کیا جو بقول غالب پیراہنِ یوسفؑ نے یعقوب علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ مجھے اس خط سے یہ معلوم ہو کر بہت افسوس ہوا کہ محترم ابوالنصر محمد خالدی صاحب دہلی تشریف لائے تھے اور انھوں نے مجھ ایسے ناکارہ انسان کی عزت افزائی کے لیے دہلی یونی ورسٹی تک دریافت حال کیا۔ میری جانب سے بہت بہت شکریہ ادا کر دیجیے۔ میں بہت متاسف ہوں کہ ان سے مل کر شرفِ قدمبوسی حاصل نہ کر سکا۔ خیر:

گر بما نیم زندہ بر دوزیم　　دامنے کز فراق چاک شدہ
ورنما نیم عذر ما بپذیر　　اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آج کل گرمی سے اوسان پگھلے جا رہے ہیں۔ کوئی کام ڈھنگ

سے نہیں ہوتا۔ اس جاں گسل موسم میں حیدرآباد کی خنک شامیں اور بھی ستاتی ہیں خصوصاً یہ تصوّر کہ اگر میں اس زمانے میں وہاں ہوتا تو آپ سے کیسی کیسی طویل ملاقاتیں ہوتیں۔ اسے اپنے کرم نامے کی صرف رسید سمجھیے۔ اس کا جواب پھر لکھوں گا اطمینان سے۔ والسلام۔

آپ کا بندۂ بے دام
نثار احمد فاروقی

(۵) گلی قاسم جان ۔ دہلی — مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۶۳ء

حضرت!

بہت دلوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے!

آنکھیں سواد تحریر سے روشن ہوگئیں مگر دل آپ کی پریشانیوں سے بہت کڑھا۔ میں بھی آج کل بہت پریشان ہوں معاشی تنگی کے علاوہ ذاتی پریشانیاں اور بھی ہیں صحت بھی بے وفائی کرتی رہتی ہے۔ اِدھر چھوٹا بھائی تقریباً ڈیڑھ سال سے بیمار ہے۔ اس کا علاج جاری ہے اِدھر مجھے اپنی تعلیم کے ساتھ خاندان کے مصارف کا بار بھی اُٹھانا پڑتا ہے۔ ملازمت ترک کرچکا ہوں مدار توکّل پر ہے لکھنا پڑھنا و مضمون نگاری وغیرہ یک قلم موقوف ہوچکی ہیں "کچھ دل سے اور ان کے ناوک مژگاں سے" چھیڑ بھی چلی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ فکرِ معاش عشق بتاں یادِ رفتگاں اتنی پریشانیوں میں اسیر ہوں اگر آپ حضرت بندہ نوازؒ کے مزار مبارک پر زمین بوس ہوکر میرے لیے دعا فرمائیں گے تو ممنون ہوں گا۔ اور اسے آپ کی محبت کا نشان سمجھوں گا۔ یہاں میں آپ کے لیے دل سے دُعا کرتا ہوں۔ مگر ایک بلا زدہ کی

دعاؤں میں دوسرے کے غم کے لیے کیا اثر ہو سکتا ہے؟ اپنا حیدرآباد کا پتہ لکھیئے۔ کل ہی "شہباز" ملا ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ اس میں ابھی تک کچھ نہ لکھ سکا۔ اب کوشش کروں گا

والسلام

نثار احمد فاروقی

[۶] گلی قاسم جان۔ دہلی ۶ ۵ر اگست ۱۹۶۴ء

محب صادق الولا۔ تسلیمات۔

امروہے سے ۲۲ر کو چلا، مگر دہلی آکر ابھی تک آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ آپ کے مستجاب الدعوات ہونے پر رشک آتا ہے بلکہ گلبرگہ آکر آپ سے بیعت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یکم اگسٹ سے میرا تقرر دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ عربی میں لکچرار کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔ الحمد للہ۔ حضور بندہ نوازؒ میں میری طرف سے ہدیۂ تشکر و نیاز پیش فرما دیں۔ آپ کو مٹھائی وہیں آکر کھلاؤں گا ابھی ذرا سی دُعا کی ضرورت اور ہے۔ ایک تو یہ کہ جگہ فی الحال عارضی ہے۔ ایک سال کے بعد مستقل ہونے کا امکان ہے حضور خواجہؒ میں یہ بھی دعا فرمائیے کہ مستقل ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ خدا لاج رکھ لے۔ نبھ جائے۔ میں اپنے کام سے عہدہ برآ ہو سکوں۔ استاد کا منصب بہت نازک ہوتا ہے۔ صحیح علم کو پھیلانا اور ہے اور علم نما جہالت کا عام کرنا تو خیر عام ہے۔ بہر حال اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

والسلام

نثار احمد فاروقی

طیب انصاری صاحب کے چند خطوط کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے!

[۱] شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، گلبرگہ ۱۸ اگست ۱۹۶۸ء

محترم و معظم!

تسلیم۔

کیوں قبلہ کیا بات ہوئی۔ خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ طبیعت کی ناسازی کے باوجود آپ خطوط لکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں آپ کا کوئی عنایت نامہ نہیں ملا۔ دل بے چین ہے۔ ادھر "تحریر و تنقید" نے خوب ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ لوگ ڈانڈا لے کر پیچھے پڑے ہیں تبصرے کیا ہیں ایٹم بم ہیں۔ بلٹز میں محترم اختر صاحب کا تبصرہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے میر حسن صاحب کا تبصرہ قدرے اُمید افزاء رہا ہے۔ محترم اختر حسن صاحب نے بلٹز میں اور "حیات" دہلی کے تبصرہ نگار نے جس شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے اس سے میری ہمت بندھی ہے کیوں کہ ترقی پسندوں کی یہ بوکھلاہٹ میرے کامیاب حملہ کا بیّن ثبوت ہے۔ تیر نشانہ پر لگا ہے۔ سنا ہے "ہماری زبان" میں بھی تبصرہ آیا ہے، ابھی دیکھا نہیں۔ اچھا کیا آپ نے اپنی رائے محفوظ رکھ لی! کتاب تو اس قابل تھی ہی نہیں کہ آپ قلم اٹھاتے یا پھر آپ نے شاید خیال فرمایا ہوگا کہ میں آپ کے اعتراضات کی تاب نہ لا سکوں گا؟! مجیب الرحمٰن صاحب نے میری خواہش پر بڑا اچھا تبصرہ لکھا ہے۔ اچھا سے مراد میری تائید میں نہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ انداز شگفتہ ہے پڑھ کر بار محسوس نہیں کرتا۔ مخلص

طیب انصاری

(۲) محترم رفعت صاحب قبلہ	۱۸ر ڈسمبر ۱۹۶۸ء

تسلیم۔

دو ایک روز پہلے آپ کا عنایت نامہ نظر نواز ہوا خوشی کی بات ہے کہ آپ جشن غالب کے سلسلہ میں شائع ہونے والے سا وینیر کے لیے ایڈیٹر نامزد کئے گئے ہیں۔

..... "معراج العاشقین" سے متعلق بحث رہی۔ میری خواہش ہے کہ اس نزاعی تصنیف کے بارے میں آپ بھی اظہار رائے فرمائیں۔ میں نے اپنی ہی رائے جو قتیل صاحب قبلہ سے قریب تر ہے لکھ بھیجا ہے۔..... بہرحال اس تصنیف کے بارے میں آپ جیسے ماہرین دکنیات کی طرف ہماری آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ مزاج قبلہ!؟ مخلص

(۳) ایوان شاہی کالونی۔ گلبرگہ	۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۲ء

محترم رفعت صاحب قبلہ!

السلام علیکم۔

ابھی آپ کا بصیرت افروز مضمون مہاتما گاندھی سے متعلق آل انڈیا ریڈیو سے سنا۔ ہر ہر جملے سے آپ کی علمیت اور بصیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد آپ کی آواز سننے کو ملی اس کے لیے میں متین سروش صاحب کا شکر گزار ہوں۔ متین سروش صاحب کی نظم خوب تھی اور خوب صورت آواز میں سنائی گئی!..... آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ فقط

(۴) گرامی قدر!	۲۵ر ڈسمبر ۱۹۷۲ء

تسلیمات!!

ابھی ابھی "شاعر" کا تازہ شمارہ (جلد ۴۳ شمارہ ۱۰) آیا ہے۔ اس میں میرا لکھا خاکہ "سید مبارز الدین رفعت" شائع ہوا ہے۔

توقع ہے کہ اعجاز صاحب نے آپ کو بھی شمارہ بھیجا ہوگا مضمون کے بارے میں آپ کی رائے کا انتظار ہے۔ کوتاہیوں کے لیے قبل از قبل معذرت خواہ ہوں۔ عرس شریف کے سلسلہ میں پروفیسر ہاشم علی صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ آپ کے بارے میں پوچھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ مکمل ٹھیک ہو جائیں۔

فقط۔

(۵) محترم و مکرم! ۱۲ر جون ۱۹۷۳ء

السلام علیکم۔

چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ بہت دنوں سے آپ کا خط نہیں آیا۔ بے چینی محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرے لکھے خاکوں کا مجموعہ "میرا شہر میرے لوگ" طباعت کے مراحل میں ہے۔ کتاب چھپ کر ماہ اگسٹ تک آ جائے گی۔ تو خدمت میں ضرور روانہ کردوں گا۔ اس مجموعہ میں محبوب حسین جگر، یم نرسنگ راؤ، اشفاق حسین، سید مبارز الدین رفعت، میر حسن، زینت ساجدہ، حسن الدین احمد، شیخ محمد، شبلی یزدانی، عبدالقادر جیلانی، احسن علی مرزا، یا لز طاہرہ سعید وغیرہ سے متعلق لکھے خاکے شامل ہیں۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ "ادراک معنی" پہ "سب رس" کے لیے اپنا تبصرہ ضرور بھیجئے گا۔ فقط

مخلص

طیب انصاری

گلبرگہ

۲۹ر نومبر ۱۹۶۰ء

شفیق محترم تسلیمات!

"یہ سور ما ہمارا" اور "نقوش" شکریہ کے ساتھ واپس کر رہا ہوں۔ شرمندہ ہوں اور معافی کا طلبگار ہوں۔ پتہ

نہیں کتنی گستاخیاں کر ڈالیں۔ آپ کا وجود تو الطاف و عنایات کا ایک وسیع اور اتھاہ سمندر ہے۔ اس میں اگر گستاخیوں اور غلطیوں کے کنکر پھینکے بھی جائیں ان کی حیثیت کہاں باقی رہے گی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی چاہتا ہوں کہ آپ سے باتیں کروں، زیادہ سے زیادہ قریب رہوں، آپ کی بیش گراں معلومات سے استفادہ کروں اور آپ کی پُر لطف صحبتوں سے فیض حاصل کروں لیکن زمانے نے اتنے دکھ دیئے ہیں کہ میں خود اپنے وجود سے پشیمان ہوتا جا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سنسان خلاؤں میں گم ہو جاؤں...

یہ ہے میری کہانی۔ دعا فرمائیے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ میری یہ کہانی خود مجھے جھوٹی معلوم ہو لیکن حال یہ ہے :

ع
شمع کچھ دیر میں بجھ جائے گی مر جاؤں گا۔

غم نصیب

حمید الماس

"انتخاب کلام صفی" (مطبوعہ ۱۹۶۳ء) وصول ہونے پر جناب اقبال متین صاحب نے اس مکتوب کے ذریعہ اپنے جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

سردار منزل۔ چراغ علی گلی۔ حیدرآباد ۵ر جنوری ۱۹۶۴ء

برادر محترم ۔ تسلیم و نیاز

کلام صفی کی صورت میں آپ کے اخلاص کے لیے ممنون ہوں۔ زمانے سے آپ سے متعارف رہا ہوں لیکن شومئ قسمت کہ نیاز حاصل

نہ کر سکا۔ ظفر نے آپ کے اوصاف بتا کر شوقِ ملاقات کو اور ہوا دی ہے۔ اب کبھی آؤں گا تو ضرور ملوں گا۔

آپ نے صفی کا انتخاب شائع کر کے ان کے بے عمل "تلامذہ" کو ایک لمحۂ فکر عطا کیا ہے۔ پتہ نہیں اب بھی جانشینی اور مسند نشینی کے دعویداروں کو اپنے فرائض کا احساس ہوگا کہ نہیں، ورنہ میں تو یہ سمجھا ہوا تھا کہ ہم صفی کے دیوان ہی کو رو بیٹھیں گے۔ اگر آپ اس ذمہ داری کو محسوس نہ کرتے تو یہ انتخاب ہی شائع نہ ہوتا!

سُنا ہے کوئی صفی سوسائٹی یا انجمن صفی کہیں ہے ــــ ہوگی۔ وہاں دو چار مل بیٹھتے ہوں گے ــــ جبہ و دستار کی باتیں ہوتی ہوں گی اور غم صفی کا کھاتے ہوں گے ــــ ہائے رے اہلیانِ علم و ادب کی کساد بازاری ــــ آپ نے شاید مصلحتاً یا اپنی شرافتِ نفس کے پیشِ نظر ایسی کوئی بات اپنے مقدمہ میں نہیں چھیڑی کہ مبادا سجادگانِ درگاہِ صفی معترض ہوں، لیکن میں ادب کے ان مجاوروں کو نہیں بخشوں گا۔ ارادہ ہے آپ کے اس انتخاب پہ تبصرہ کروں اور دکھاؤں کہ علم و ادب کی خدمت گزاری اس طرح ہوتی ہے۔

صفی کے کلام کے انتخاب میں آپ نے نہ صرف یہ کہ بڑی محنت کی ہے بلکہ اپنے ذوقِ شعر کا بھی ثبوت دیا ہے۔۔۔۔

جہاں تک صفی کی شاعری کی روح کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ یقیناً یہ انتخاب صفی کے کلام کی نمائندگی کرتا ہے۔۔۔

لوگ صفی کے روزمرہ اور محاوروں کے استعمال کی چکا چوند میں کھو کر خود صفی کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس طرح انھیں ان کی شاعری کی گیرائی اور گہرائی کا ادراک نہیں ہوتا۔ میری استدعا ہے آپ اس موضوع پر لکھیں۔ آپ ہی اس موضوع سے پورا پورا انصاف کر سکتے ہیں۔

اس انتخاب کے لیے مبارکباد قبول فرمایئے۔ شوق نے بات کیا بڑھائی ہے۔ خط بہت طویل ہوگیا۔ معذرت خواہ ہوں۔

مخلص

اقبال متین

اس صدی کے نصف دوم میں دکنی شاعری کے بڑے ہی کامیاب اور مقبول شاعروں میں جناب سلیمان خطیب کا نام بھی اپنی انفرادیت کی وجہ سے بہت ہی مشہور ہے۔ ان کی اچھوتی اور انوکھی تشبیہات دکنی شاعری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ اپنے کلام کے ذریعہ ہنستے ہنستے رُلانے والے اور رلاتے رلاتے ہنسانے والے اس باکمال شاعر کے خطوط کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) پانی محل۔ گلبرگہ مورخہ ۸ر نومبر ۱۹۶۴ء

ادب نواز!

سرزمین بندہ نواز کا سلام قبول فرمایئے۔ آپ کی یاد بے اختیار آگئی۔ کل ٹبلی الادہ میں بزم اردو ادب کی طرف سے ہماری گلپوشی کی گئی۔ گلبرگہ کالج کو ایک قرارداد روانہ کی گئی۔۔ ۔۔۔ ادھر خطیب نمبر کا مطالبہ شدت سے ہو رہا ہے۔ اس پراگندہ اور "خرافات" کو آپ نے کچھ اس سلیقے سے پیش کیا کہ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ورنہ کلام خطیب میں کوئی جان نہ تھی۔ میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟ دُعا بھی نہیں کرسکتا کیوں کہ آپ سادات میں آپ کی دُعاؤں کا میں محتاج ہوں۔ دُعا فرمایئے۔ خدا آپ سے تادیر اُردو ادب کا کام لے آفتاب و مہتاب کی عمر ہو بی بی طاہرہ رفعت سلمہا (منجھی صاحبزادی) کو لاکھوں دُعائیں۔ آپ گلبرگہ کب آرہے ہیں؟ وہاں (دیبو) کیا احوال ہیں؟ جی چاہتا ہے کہ کبھی آکر "پاؤں پڑوں"۔ خادم خطیب

[۲] مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۶ء

خطیب نواز!

کرم نامہ نظر افروز ہوا شکریہ۔ آپ جیسا "ادیب شہیر" خطیب جیسے "شاعر حقیر" کو یاد کر لیتا ہے۔ یہی احسان کیا کم ہے۔ آپ نے کچھ انداز سے مجھے روشناس کرا دیا کہ آج سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ع کارِ جہاں دراز ہے تو بھرا انتظار کر . . . . قبلہ! ان مصائب میں کیوں گرفتار ہوتے ہو؟ سلیمان خطیب پر کافی روشنی ڈال چکے ہو بلکہ روشنی پھیلا چکے ہو۔ کیا طبیعت سیر نہیں ہوتی؟ میرے مالک! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ درِ دولت پر سر کے بل آؤں گا (گو سر میں بال نہیں) آپ کا حکم کیسے ٹالا جائے؟ "فرمان مبارک" سے کیسے روگردانی کی جائے۔ ہاسن آؤں گا۔ وہاں سے "مہارانی کالج" میسور حاضر ہوں گا اور حکم؟ نومبر کے پہلے ہفتہ میں حاضر ہوتا ہوں۔ بسر وچشم قبول!

خادم
سلیمان خطیب

[۳] مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء

کرم گستر!

مکتوب گرامی باعث نواز ہوا۔ یاد فرمائی کے لیے ازحد ممنون ہوں۔ عثمان شاہی ملز ناندیڑ میں اچھا مشاعرہ ہوا۔ اورنگ آباد سے فضیل جعفری، بشر نواز وغیرہ آئے تھے۔ حیدر آباد سے طالب رزاقی اوج یعقوبی، انور معظم، کنول پرشاد کنول۔ مشاعرہ ہم نے لوٹا۔ طالب اچھے رہے۔ بمبئی میں عبدالحمید انصاری صاحب مدیر "انقلاب" کے پاس ایک ہفتہ قیام رہا۔ ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ بمبئی کے تیس ۳۰ شعراء نے حصہ لیا۔ یہاں میرے "دکنی لوک گیت" بہت پسند

کیئے گئے جس کو وہاں کے ایک گلوکار نے پیش کیا۔ ڈائرکشن مینا قاضی کا تھا۔ یہ سب آپ جیسے سید زادوں کی دعا کی برکت ہے۔
۵ / نومبر کو ہاسن میں مشاعرہ ہے۔ بلیسور بھی ضرور آؤں گا انشاء اللہ

فقط خادم
خطیب

(۳) مورخہ ۱۵ / نومبر ۱۹۶۶ء

رفعتِ ادب ! میرے محسن !

نوازشات بیہم کے لیے مشکور رہوں۔ گلبرگہ بخیر پہنچ گیا۔ مگر ایک روز تاخیر سے گنتکل کی گاڑی مل نہ سکی۔ دن بھر عالمِ اضطراب میں پلیٹ فارم پہ ٹہلتے رہا۔ گلبرگہ ریڈیو کا پروگرام خدا حافظ ہو گیا۔ مگر میرے بھائی ! آپ نے میرے لیے کتنی زحمت اُٹھائی۔ خصوصاً بھابی۔ ؎

ایک مریمِ سراپا کہ "حسن ثواب"
جس کے چہرے پہ کھلتے ہیں لاکھوں گلاب
بات سچی ہے جو بھی' بہر حال ہے
گھر میں بھابی کے دم سے ہی اقبال ہے

مہاراتی کالج کی طالبات نے جس پر خلوص طریقے سے استقبال کیا اس کے لیے سپاس گزار ہوں۔ اور بھی شعر بعد میں لکھوں گا۔ خاں صاحب کیسے ہیں ؟

بہت یاد آتے ہیں عبدالحمید ۔۔۔ جن کے لطف و کرم کا ہے بندہ مرید
ایک انسان مجسم بڑے پیار کا ۔۔۔ ایک غازی مکمل ہے کردار کا

فرمایئے ! مولوی عبدالقادر صاحب پروفیسر کے لیے کیا لکھوں ؟

جن کے سینے میں پنہاں ہیں اسرارِ طور ۔۔۔ جن کے چہرہ پہ صبحِ مدینہ کا نور
عجب ہے تماشہ خدا کی قسم ۔۔۔ کلیسا میں روشن ہے شمعِ حرم

پروفیسر خالدہ ادیب کیلئے علٰحدہ شعر لکھتا ہوں۔ سلام فرمایئے۔ خادم، خطیب

(۵) مورخہ ۲۳ر ڈسمبر ۱۹۶۷ء

رفعتِ ادب مدظلہ۔

تسلیم بصد تعظیم!

کرم نامہ نظر نواز ہوا۔ آپ کے بے پایاں خلوص کے لیے سپاس گزار ہوں۔ آپ میری خاطر کتنی زحمت اٹھاتے ہیں۔ آپ میرے بے غرض محسن ہیں۔ عالی جناب مولوی محمد علی صاحب منسٹر سے بات ہوئی ...... میں محبوب نگر گیا ہوا تھا اس لیے جواب نہ دے سکا۔ معافی کا خواستگار ہوں۔ وہاب صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ بھابی کو سلام۔ بچوں کو دُعا۔ خادم

سلیمان خطیب

(۶) مورخہ ۱۰ر اپریل ۱۹۶۸ء

رفعتِ اعظم۔ زندہ باد!

ایسی ہزاروں ترقیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ آج میری مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ آپ کو ترقی مل گئی۔ پرنسپل ہو گئے اور میرا سر آسمان کو چھو گیا! اللہ تیرا احسان ہے۔ آپ نے مجھے اس کی اطلاع نہیں دی لیکن اکبر الدین صدیقی صاحب نے دی۔ میرے گھر کا گھر خوش ہو گیا ... بھابی کو مبارکباد پہنچائیے کہ اب وہ مسز پرنسپل ہیں۔ خادم سلیمان خطیب

محترمہ قرۃ العین حیدر اور زہرا حیدر کے خطوط کے عکس، ابھی ابھی ہمدست ہوئے ہیں۔ ان کی نقلیں اور اقتباسات قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش خدمت ہیں۔

(۱) یٰسین منزل۔ علیگڈھ ۳۰ر جنوری ۱۹۶۰ء

محترم مبارز الدین صاحب، آداب عرض ہے۔

میں نے ۲۵ر تاریخ کو آپ کی خدمت میں ایکسپریس ڈلیوری سے

احفاد حسین کا مضمون "یلدرم کی شاعری" بھیجا تھا۔ یقین ہے کہ اس خط سے پہلے مل گیا ہوگا، حالانکہ درمیان میں ۲۶ر جنوری اور اتوار کی چھٹی آگئی تھی۔

آپ کا ۲۴ر کا خط (ملفوف) ۲۷ر کو ملا۔ اس کا دلی شکریہ آپ نے بہت تفصیل سے سب مضامین کی فہرست دے دی ہے جو آپ کے پاس ہیں۔ آپ نے یلدرم پہ تقریباً سارا ہی مواد اکٹھا کر لیا ہے۔ جو تھوڑی بہت کمی ہے میں پوری کرنے کی کوشش کروں گی۔ عینی نے بھی اب تک اپنے موعودہ مضامین بھیج دیئے ہوں گے۔

..... آپ کے سب خطوط مجھے مل گئے۔ یلدرم کی تحریر تلاش کروں گی لیکن اس کے لیے آپ قرۃ العین حیدر کو لکھیں، وہ بہت آسانی سے بغیر کسی دقت کے آپ کو فوراً بھیج دیں گی۔

..... ہاں ایک بات اور ہے، اور وہ یہ کہ آپ بار بار شکریہ ادا کر کے اور معذرت کر کے مجھے شرمسار نہ کریں۔

اب رخصت ہوتی ہوں۔

خاکسار

زہراء حیدر

[۲]

علی گڑھ۔　　　　۲۰ر فروری ۱۹۶۰ء

محترمی سیارز الدین صاحب، آداب عرض ہے۔

آخری قسط بھی مضامین کی بھیج چکی ہوں۔ میری جلد بازی اور حماقت سے میں نے بہت سے وہ مضامین بھی بھیج دیئے جو ان کے مجموعوں میں شریک ہیں مثلاً سفر حجاز، یادِ رفتگاں، کوسم سلطان وغیرہ۔

دوسری تصویر میں خود ہوا کر اس کی کاپی آپ کو بھیجتی مگر اس خیال سے کہ اس کی وجہ سے پہلی تصویر کو دیر نہ ہو جائے

اس کو بھی نہ بنوا سکی، اب تو سپردم بتو مایۂ خویش را۔

ڈاکٹر سید محمود (بہار کے منسٹر) سے میں نے درخواست کی تھی، انھوں نے بصد خوشی وعدہ کیا ہے۔۔۔۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کے مضمون کے لیے جگہ چھوڑ دیں۔

اب جلدی میں ہوں، لہٰذا رخصت

باقی تصویر کی رسید ملنے پر

خاکسار

[۱] زہراء

۶۱۔ ڈی، گارڈن روڈ، کراچی مورخہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۶۰ء

محترمی! تسلیم۔

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا دلی شکریہ۔ عرصہ ہوا میں نے ڈھاکہ میں آپ کی کتاب "سجاد حیدر یلدرم" ایک صاحب کے پاس دیکھی تھی۔ میں نے اس کتاب کو پاکستان میں بہت تلاش کروایا۔ اپنی بہن کو علیگڑھ بھی لکھا کہ وہاں ڈھونڈیں مگر آج تک کہیں سے دستیاب نہ ہو سکی۔ اس وقت بھی میں نے اسے سرسری طور پر دیکھا تھا کیوں کہ جو صاحب اسے ہندوستان سے لے کر آئے تھے وہ اسے چند روز کے لیے بھی مستعار دینے تیار نہ تھے۔ بہرحال آج آپ کا خط آیا تو یقین فرمایئے بے حد خوشی ہوئی۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یلدرم پر اس قدر کم لکھا گیا ہے۔ ہم لوگوں کو آپ کا اور نثار احمد فاروقی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ آپ "نگار نذری" کا خاص نمبر اس سلسلے میں شائع کر رہے ہیں۔ جس حد تک مجھ سے ممکن ہے میں آپ کی مدد کروں گی۔

میں نے قاضی عبدالغفار کا مضمون بھی آج تک نہیں دیکھا۔ صرف رشید احمد صدیقی اور پطرس والے مضمون دیکھے ہیں۔ اگر آپ

چاہیں تو خواجہ غلام السیدین اور نیاز فتح پوری سے بھی لکھوا سکتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں آپ نے اور کس کس سے لکھوایا ہے۔ اگر آپ مجھے فہرست بھیج دیں تو ممنون ہوں گی۔ یہاں سے جلیل قدوائی صاحب آپ کی کافی مدد کر سکتے ہیں۔ میرے چاروں مضمون اگر آپ چاہیں تو میں نظر ثانی کر کے خود آپ کو بھیج دوں گی بلکہ میں یہی پسند کروں گی کہ ان کو موجودہ صورت میں شائع نہ کیا جائے۔ والدہ کا مضمون یلدرم کی تصویر، غیر مطبوعہ نظمیں اور تحریریں بھی ساتھ ہی بھیج دونگی میرے پاس ان کی ایک بے حد تاریخی تصویر موجود ہے جو علی گڑھ یونی ورسٹی یونین کا گروپ فوٹو ہے۔ شاید ۱۹۰۲ء کا جب یلدرم یونی ورسٹی یونین کے صدر تھے۔ اس میں سب ایسے طالب علم موجود ہیں جو بعد میں ادب اور سیاست کی نامور ہستیاں بنے۔ ان سب کے نام معلوم کرنے کے لیے آپ کو کسی پرانے علیگڈھ والے سے (یا رشید احمد صدیقی سے) دریافت کرنا پڑے گا۔ ... اگر آپ میری بہن زہراء حیدر کو علی گڑھ خط لکھیں تو وہ یلدرم نمبر کے سلسلے میں آپ کی مزید مدد کر سکیں گی۔ ...

یہ ساری چیزیں جمع کرتے میں ذرا وقت لگے گا۔ آپ کا خط آنے پر میں جلد از جلد آپ کو مطلوبہ سواد روانہ کر دوں گی۔ اُمید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام۔

خاکسار
قرۃ العین حیدر

(۲)　کراچی۔　۲۷ دسمبر ۱۹۶۰ء

محترمی! تسلیم۔

گرامی نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ میں اپنے تینوں مضامین اور والدہ کا مضمون ٹائپ کروا کے اسی ہفتہ کے اندر اندر روانہ

کر دوں گی۔ تصاویر کے نئے پرنٹ بنوانے میں بھی دو چار دن لگیں گے۔ آپ نے لکھا ہے کہ رسالہ جنوری میں شائع ہو جائے گا۔ اگر آپ نے ایک دو مہینے پہلے مجھے لکھا ہوتا تو سارا کام زیادہ سہولت سے ہو جاتا۔۔۔۔ ایک بات اور۔ میرے "سفینۂ غمِ دل" والے باب کا عنوان" اور ابا میاں مر گئے" کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اور کوئی عنوان لکھ کر بھیج دوں۔ والدہ کے مضمون کے ساتھ ان کے متعلق ایک پانچ چھ سطر کا نوٹ بھیج دوں گی۔ اور کوئی خدمت۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

مخلص

قرۃ العین حیدر

اس کے بعد محترمہ قرۃ العین حیدر جہاں بھی رہیں [یعنی کراچی، سلہٹ، لندن] وہاں سے برابر مضامین، نظموں، تحریروں اور تصویروں وغیرہ سے متعلق مسلسل مراسلت رہی۔ اسی طرح محترمہ زہراء حیدر سے بھی قلمی ربط جاری رہا۔ چناں چہ والدہ کے علاج کے سلسلہ میں جب محترمہ قرۃ العین حیدر لندن میں مقیم تھیں، تب بھی یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ اس خط کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے۔

[۳]

سینٹ اسٹیفن گارڈنس۔ لندن

۱۲ر اپریل ۱۹۶۱ء

محترمی! تسلیم۔

۲۸ر فروری کے گرامی نامہ کا شکریہ۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ مضامین کے ردوبدل کے سلسلے میں آپ کو اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔۔۔۔ مجھے ندامت ہے کہ اس سلسلے میں کتنی کوفت ہوئی اتنے فاصلے پر بیٹھ کر خطوں کے ذریعہ کسی مجموعے کی ترتیب کے دوران اس قسم کی غلط فہمیاں اکثر ہو جاتی ہیں۔ زہراء آپا کے خط سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مضامین نقل کرنے کے چکر میں کافی دوڑ دھوپ کی۔ خدا کرے کہ آپ سب کی محنت کامیاب

ہو.......

دلّی سے مجھے اطلاع ملی ہے کہ "آگ کا دریا" میری اجازت کے بغیر کسی پبلشر نے [پنجابی پستک بھنڈار، دہلی] ہندوستان میں شائع کرلیا اور پاکستان میں چوں کہ اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ یہ ہندوستانی غیر قانونی اڈیشن وہاں دھڑا دھڑ بک رہا ہے۔ اس کتاب کا حق اشاعت زہرا آپا کے نام محفوظ ہے۔ اس کے باوجود اسے ضبط کرلیا گیا۔ اب بتائیے اس دھاندلی کا کیا علاج ہے؟

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

خاکسار

قرۃ العین حیدر

یٰسین منزل۔ علی گڑھ ۵ جون ۱۹۶۱ء

[۳] محترمی! تسلیم۔

عین انتظار میں دو تین روز ہوئے آپ کا فرستادہ "یلدرم نمبر" ملا۔ اس کے ساتھ آپ کا والا نامہ بھی، جس کے لیے دل سے مشکور ہوں۔

جس محبت، عقیدت اور خلوص سے آپ نے "یلدرم نمبر" کو شائع کیا ہے، وہ اس سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ میں آج کل امتحانوں کی کچھ کاپیاں دیکھنے میں بے حد مصروف ہوں لیکن دل نہیں مانا اور ادھر ادھر سے اس کو دیکھ ہی لیا۔ کافی جامع اور محنت کی چیز ہے۔ آپ نے یہ راستہ دکھا دیا..... جیسا کہ آپ نے لکھا کہ ان کی بیٹی اور بیوی دونوں صاحبِ قلم ہیں لیکن دونوں نے اب تک ان کی زندگی کے حالات نہیں لکھے۔ یہ اتفاق نہیں ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ ادھر بہت پریشان رہے

ہیں۔ ذرا سکون ہونے پر آپ کی اس تجویز سے ضرور کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلے گا۔

آپ نے رسالہ میں بھی اور خط میں میرا اتنا زیادہ شکریہ ادا کرکے مجھے شرمندہ کیا ہے۔ شکریہ تو ہم کو آپ کا ادا کرنا چاہیئے کہ جو ہمارا فرض تھا، وہ خلوص اور عقیدت میں بڑھ چڑھ کر آپ نے ہم سے زیادہ خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ یقین ہے کہ اس کی ایک کاپی آپ نے قرۃ العین حیدر صاحبہ کو کراچی کے پتہ پر ضرور بھجوادی ہوگی۔ اگر کبھی موقع ہو تو علی گڑھ ضرور تشریف لائیں۔

اب رخصت ہوتی ہوں،

زیادہ آداب

خاکسار

زہراء حیدر

یلیین منزل۔ علی گڑھ		مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۶۱ء

[۴]

محترمی! تسلیم۔

میں پچھلے دنوں یہاں آئی تو "پگڈنڈی" کا "یلدرم نمبر" دیکھنے کو ملا۔ واقعی آپ کی یہ کاوش قابلِ تعریف ہے کہ اِس قدر جامع اور خوبصورت نمبر مرتب کردیا ..... آپ نے یہ بہت بڑا ادبی کام کیا ہے جس کے لیے ہم سب کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیئے ..... اگر ہو سکے تو "پگڈنڈی" کے اگلے شمارے میں تصحیح چھپوا دیجئے کہ یلدرم کے چھ لڑکوں لڑکیوں میں سے دو زندہ ہیں ـــــ میرے بڑے بھائی سید مصطفیٰ حیدر جو انگریزی کے پُرانے صحافی ہیں اور کراچی میں چند امریکن نیوز ایجنسیوں کے نمائندے ہیں اور ایک یہ خاکسار ـــــ نیز یہ کہ میرا سِن

ولادت ۲۷ ۱۹ء ہے۔ اُمید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خاکسار

قرۃ العین حیدر

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی صاحب کے تفصیلی خطوط کا اختصار:

شعبہ فلسفہ و نفسیات ۱۰ر نومبر

گورنمنٹ کالج۔ اورنگ آباد ۵۶ ۱۹ء

[۱] رفعت! ایک زمانہ بیت گیا تم کو مخاطب کئے۔ میں نہیں چاہتا کہ حیدرآباد کے ٹوٹ جانے کا اثر ہماری اور تمہاری دوستی پر پڑے۔ اس سیاسی قطع برید کا اثر سبھی حیدرآبادیوں کے ذہنوں پر پڑا ہے مگر اس افسوس کا حاصل سوائے ذہنی خلفشار کے کچھ نہیں ..... اجنتا اور ایلورہ پر میرا چھوٹا سا بک لٹ شائع ہو گیا ... لکھنؤ سے میرا ایک ناول شائع ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ناول لکھنے کا ڈھنگ آگیا ہے .... تمہارا۔

صفی الدین صدیقی

۱۱ر جنوری ۵۸ ۱۹ء

[۲] رفعت! پرسوں ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ آثارِ قدیمہ بالخصوص اجنتا پہ تم نے جو کچھ مواد جمع کیا ہے۔ تمہاری اس ہمت کی داد دیتا ہوں .... شاعر تو میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتا البتہ شعر موزوں کر لیتا ہوں۔ محض تفریح اور شغلہ کے طور پر۔ تمہیں غالباً یہ سن کر تعجب ہوگا کہ عم محترم ڈاکٹر رضی الدین صاحب بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔

تمہارا

صفی الدین صدیقی

۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۰ء

[۳] ہمدمِ دیرینہ! تمہارا محبت نامہ ملا۔ میری بے تابی کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ ادھر تمہارا مکتوب ختم ہوا اور میں قلم لے کر تمہاری طرف دوڑ پڑا۔ میرے رفیق! سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اور کس انداز میں تمہاری دل جوئی کروں۔ بس اسی منزل پر آکر تمام فلسفہ گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ تمہاری محرومی اور مجبوری اتنی شدید ہے کہ اب اس کا مجھ پر بھی اثر ہونے لگا ہے۔ یاسؔ چنگیزی کا شعر مجھے ایک ابدی دنیا میں لے گیا۔ میں ان سے حیدرآباد میں ایک ہی مرتبہ ملا ہوں جب کہ میرا شعور ابھی پختہ نہیں ہوا تھا اور خوب و زشت کی پہچان بھی نہیں تھی۔ اب سوچتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ اردو والوں نے ایسے گوہرِ یگانہ کی قدر نہ کی۔ جو صاحبِ نظر ہیں وہ تو یاسؔ چنگیزی کے آرٹ کے قائل ہیں۔ یہاں پر میرا اشارہ تو محض خدایانِ تنقید کی طرف ہے جو سراب کے پیچھے تو دوڑتے ہیں اور چشمۂ آبِ حیواں سے سیراب ہونا نہیں جانتے ۔ ۔ ۔ ۔ اب اجازت دو۔ تمہارا

صفی

[۴]

۲۲ر فروری ۱۹۶۱ء

رفعت پیارے! تمہارا خط ملا۔ یقین مانو کام کی زیادتی اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے تمہارے خطوط قلب کو بڑی راحت اور بڑا سکون بخشتے ہیں۔ یوں احساس ہوتا ہے کہ چلو اس بھری دنیا میں ایک تو یارِ وفادار ہے جو تغافل شعار نہیں جو اپنا دکھ اور سکھ بانٹ تو لیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اب آئندہ دو سالوں میں ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں مصروف رہوں گا۔ خدا اس آزمائش میں بھی مجھے کامیابی عطا کرے۔ ابھی تو سفر کا آغاز ہے اور منزل بہت دور ہے ۔ سوچتا ہوں کہیں یہ بات پیش نہ

آئیے۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے

اپنے دوستوں اور بزرگوں کی دعاؤں اور ہمت افزائی کا طالب ہوں۔ تمہارا اپنا

صفی الدین صدیقی

[۵] ۱۹ رجون ۱۹۶۱ء

رفعت! تمہارا آخری خط آئے ہوئے کوئی پندرہ روز کا عرصہ ہوتا ہے۔ قاضی سلیم حیدر آباد سے آئے ہیں اور وہاں کے اکثر احباب کی خبر لائے ہیں.....

یلدرم نمبر بڑے انتظار کے بعد ملا۔ بہت اچھا ایڈٹ ہوا ہے شکر ہے کہ تمہاری محنت ٹھکانے لگی۔ نثار احمد فاروقی نے تمہارا تعارف جو کروایا ہے اسے پڑھتے سے تمہارے بارے میں بہت ساری باتیں معلوم ہوئیں۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ جناب مشائخ خاندان سے ہیں۔ اگر پیری مریدی کا سلسلہ ابھی تک چلا آرہا ہو تو کیوں نہ تم سے بعیت کرلی جائے؟ تصوف پر جو کام ہو رہا ہے اس کے عملی پہلو کا بھی علم ہوتا ہوگا قرۃ العین نے اپنے والد محترم پر جو مضمون لکھا ہے وہ کافی دلچسپ ہے..... باقی تمہارا خط آنے پر۔ والسلام

صفی الدین صدیقی
شرحِ دستخط

[۶] مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۶۳ء

رفعت پیارے! بمبئی سے واپسی پر تمہارا ایک اور خط مجھے ملا۔ عجیب بات ہے اس بھری دنیا میں ہم دو لوگ ہی ایسے افراد ہیں

جو بغیر کسی غرض کے ایک دوسرے کو یاد کرتے ہیں۔ کچھ تم سناتے ہو اور کچھ ہم۔ زندگی گزر رہی ہے۔ ہم لوگ جب نہیں ہوں گے تو ہمارے خطوط ہماری محبت کی گواہی دیں گے۔ پتہ نہیں ہماری آل اولاد ان کا کیا اثر قبول کرے۔ ایک بات تو واضح ہے۔ وہ یہ دیکھیں گے کہ دوستی کس چیز کا نام ہے۔

ویسے میرے احباب کا حلقہ کافی وسیع ہے اور تم نے بھی جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، کافی دوست پیدا کیے ہوں گے میرے نزدیک ملنے جلنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن سے ہماری جان پہچان ہوتی ہے اور جو حضور کے ساتھی ہوتے ہیں۔ نظروں سے اوجھل ہوئے کہ ایک دوسرے کو بھلا دیا۔ دوسرے وہ جو جان پہچان کی سرحد سے نکل کر رفاقت کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ گنے چنے ہی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سچا دوست زندگی میں مشکل سے ملتا ہے اور وہ ایک ہی ہوتا ہے!۔۔۔ میں سمجھتا ہوں ہم لوگ اسی منزل میں پائے جاتے ہیں۔ پھر نہیں معلوم اس سلسلے میں تمہارا اپنا نظریہ کیا ہے؟ میں چاہے سفر میں رہوں یا حضر میں تم کو ضرور یاد کرتا ہوں اور جہاں جہاں جاتا ہوں وہاں سے ایک خط ضرور روانہ کر دیتا ہوں۔ یہ میری عادت ثانیہ بن چکی ہے۔ رہا ایک دوسرے سے ملاقات کا سوال سو اس کو میں رفاقت کو ناپنے کا پیمانہ نہیں سمجھتا۔ شاید فصل میں زیادہ لذّت ہے۔

پریشاں کاروبار آشنائی
پریشاں تر مری رنگیں نوائی
کبھی ڈھونڈتا ہوں لذتِ وصل
خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی (اقبال)

دن بدن حیات اور اس کے حقائق سے مایوسی کا اظہار! مجھے ڈر ہے کہیں تم کو قنوطی نہ بنا دے۔ کیا پتہ تم نے قنوطیت کو ایک نظریۂ حیات کے طور پر قبول کر لیا ہو۔ کبھی کبھی تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ تم نے اپنی زندگی میں کون کون سی تمنائیں کی ہیں جو تمہیں حاصل نہیں ہوئیں.... تم ناممکن الحصول آرزوؤں کو جگہ نہ دو، ورنہ سخت مایوسی ہوگی۔

مانا کہ صحت بڑی دولت ہے مگر حاصلِ صحت کس کو میسر رہی ہے؟ علامہ اقبال کی طویل علالت کے وقفہ پر غور کرو۔ اسی طرح یورپ کے اکثر مفکر صحت کے اعتبار سے تم کو دِق الیہ نظر آئیں گے۔ عدم صحت کا رونا رونے سے تو صحت حاصل نہیں ہوتی! موت آتی ہے تو آجائے۔ ہم کو کیا پرواہ ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

میں کہتا ہوں اپنے خیالات کو مجتمع کرو اور ادھوری تخلیقات کو مکمل کرنے کی طرف دھیان دو۔ رہا قبولیت عام کا سوال سو وہ ایک نہ ایک دن مل ہی جائے گی۔

ایک بات کا احساس البتہ ضرور رہتا ہے۔ کاش تم یہاں موجود ہوتے تو میں تمہاری ذہنی کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیتا۔

والسلام
تمہارا
صفی الدین صدیقی

[۷] مورخہ ۲۳ر فروری ۱۹۶۹ چہار شنبہ

پیارے رفعت! جب بھی تمہارا خط آتا ہے تو قلب و دماغ کو سکون ملتا ہے جب تک جواب نہیں دے لیتا تسکین

نہیں ہوتی۔ کیا کروں؟ کوئی اور یار طرح دار نہیں کہ جو میرا غم خوار ہو۔

تمہاری داستانِ حیات کی جھلکیاں میں نے پڑھیں۔ یہ تمہارا دل گردہ ہے کہ ہر غم و مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ شاید مجھ میں یہ کمزوری ہے کہ ابتداء سے مجھے اس کے لیے تیار نہیں کیا گیا۔ سنتا آتا تھا کہ فلسفہ ہر غم زدہ دل کو تسلی دیتا ہے مگر میری حد تک معاملہ برعکس ہے۔ فلسفہ کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے کہ جو تشکیک پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس سے ذہن کو مزید اُلجھن ہوتی ہے۔ آپ رجائی فلسفوں کو پڑھے تو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں۔

تم نے بار بار توجہ دلائی ہے کہ ریسرچ کا معاملہ ختم کرو۔ ..... اگر جم کر کام کروں تو آئندہ تین چار ماہ میں لکھنے لکھانے کا کام ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ٹائپ کا مرحلہ اور پی ایچ ڈی کی فیس کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ پانچ چھ سو روپے کا خرچ ہے۔ سوچتا ہوں اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی۔ میری لڑکی ناز صدیقی حیدرآباد میں مس نندی انسٹی ٹیوٹ میں پڑھ رہی ہے۔ اپریل کے آخر میں علی گڈھ جائے گی۔ اس کے لیے پانچ چھ سو روپیوں کا بندوبست کرنا ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا علم اور فلسفہ اس معاشی مسئلہ کو حل کر سکتا ہے؟ پھر پھر کر معاشیات انسانی زندگی کی بنیاد بن جاتی ہے۔۔ ... مجھے امید ہے کہ تمہاری بیگم صاحبہ اور بچی اب بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

تمہارا صفی

[۸۶] مورخہ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء

رفیق رنج و محنؔ سلامت۔ تمہارا مکتوب ملا۔ خدا نے

ابھی میرا حافظہ نہیں چھینا ہے میں تم کو اسی وقت بھول سکتا ہوں جب کہ میں اپنے آپ کو بھول جاؤں یا پھر میری ہستی خاک میں مل جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ افکار اور پریشانیوں کے ہجوم میں کبھی کبھی لکھنے لکھانے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔۔۔

۔۔۔۔ بہر حال عجیب حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے۔۔۔۔ یہ سال بھی بڑا منحوس ہے۔ کیسے کیسے لوگ قیدِ زندگی سے آزاد ہو گئے۔ مئی میں ڈاکٹر ذاکر حسین، اگست میں پروفیسر ہمایوں کبیر اور مخدوم محی الدین۔ مجھے مخدوم صاحب کی اچانک موت سے بے حد صدمہ ہوا۔۔۔ میں نے ایک چھوٹا سا مضمون ان کی یاد میں لکھا ہے۔ بلٹز کو بھجوا رہا ہوں۔ ایک اور مضمون "ہمایوں کبیر میری نظر میں" کے عنوان سے شروع کیا ہے۔ وہ بھی بلٹز ہی کو چھپنے کے لیے بھیجوں گا۔۔۔۔ اس وقت دھواں دار بارش ہو رہی ہے اور رات کے دس بج رہے ہیں۔ مجھے کچھ اور خط لکھنے ہیں اس لیے رخصت۔

تمہارا
صفی

(۹) یکم جون ۱۹۷۴ء

صدیق من! بعد از ہزار سلام عافیت مطلوب تمہارا ۷ رمئی کا لکھا ہوا مکتوب ملا۔ گو کہ چند سطری تھا مگر دل کو تسکین بخشنے والا۔ اچھا ہوا کہ تم ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ رخصت اور خوشامد کے جھگڑوں سے نجات تو ملی۔ اب آرام سے لیٹ کر مطالعہ کرتے رہو۔ بشرطیکہ طبیب نے اس کے لیے منع نہ کیا ہو۔

کیا کروں خدا نے دل اس قدر رقیق بنایا ہے کہ دوست

کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ باوجودیکہ روزگار کے جھمیلے میں گرفتار رہوں، جی تمہاری طرف لگا رہتا ہے کیسے جوہرِ قابل کو خدا نے دل کا آزار دیا ہے ورنہ وظیفہ پر علاحدہ ہونے کے بعد تم علم وادب کی کیا کچھ خدمت نہ کرپاتے!

بیگم صاحبہ کو سلام۔

تمہاری عافیت کا طالب

نیاز مند

صفی الدین صدیقی

سوزوکی تاکیشی۔ مددگار پروفیسر
ٹوکیو یونی ورسٹی آف فارین اسٹڈیز
کیتاکو۔ ٹوکیو۔ جاپان۔

۲۵ر جولائی
۱۹۷۳ء

مکرمی جناب رفعت صاحب السلام علیکم!

آج سے تیرہ سال پہلے یعنی فروری ۶۰ء کے آخر میں ٹوکیو یونی ورسٹی کے پروفیسر آرا اور مسٹر ساکوسا سلطنتوں کے زمانے کی تاریخی یادگاروں کی تصویریں کھینچنے کے لیے دکن کے دورے پر گئے تھے۔ اس وقت گلبرگہ میں آپ سے دونوں کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ آپ بھول گئے ہوں گے ....

حالیہ منصوبہ کے مطابق پروفیسر آرا اگلے اگسٹ کے وسط میں حیدرآباد پہنچ رہے ہیں ان کی خواہش ہے کہ گلبرگہ میں دوبارہ آپ سے مل سکیں تب پرانی یادیں تازہ ہوجائیں گی ..... وہ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی درگاہ شریف کی زیارت بھی ضرور کریں گے و انشاء اللہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں گا.....

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپکا۔ سوزوکی تاکیشی

"منزل" ملز روڈ، گلبرگہ ۱۰ فروری ۱۹۷۵ء

استاد محترم و مکرم۔ تسلیم مع التکریم!

پرسوں برادرم حمید الماس کے بڑے برخوردار ملنسار سلمہٗ نے آپ کا وہ کرم نامہ دکھلایا جس میں گورنمنٹ کالج گلبرگہ کے "رفعت نمبر" کا تذکرہ تھا۔ مذکورہ نمبر میں آپ نے ازراہِ کرم مجھ سے بھی مضمون لینے کی جو ہدایت فرمائی ہے اُسے میں اپنے لیے باعثِ عزّت افزائی تصور کرتا ہوں۔ بدقسمتی سے میں مضمون تو نہیں لکھ سکا لیکن آپ کی شان میں چند قطعات کہنے کا وعدہ کیا تھا . . . بہر حال میں نے آپ کی ایک حقیر سی خدمت انجام دی ہے۔ آپ کو پسند آئے تو یہی میرے لیے سرمایۂ ناز ہوگا۔ جو احسانات آپ کے اور مرحوم محترم مولوی عاقل علی خاں صاحبؒ کے ہیں میں ان کا ہمیشہ معترف رہوں گا اور شائد تاحیات ان کی گرانباریوں سے سبکدوش نہ ہوسکوں گا۔ جزاک اللہ۔

قطعات

نذرِ استادِ محترم

پروفیسر حضرت سید مبارز الدین صاحب رفعت ادام اللہ اقبالہٗ

خدا کرے کہ بڑھے اور عظمتِ رفعت
رہے زمانے میں توقیر و عزتِ رفعت
یہ افتخار بہت ہے مرے لیے راہی
کہ میں ہوں خادم و شاگردِ حضرتِ رفعت



عجب مقام ہے ہر اک کتابِ رفعت کا
یہ دور بھی ہے قلمِ شعلہ تابِ رفعت کا
ادب کی بحث چھڑی ہے، تو نثرِ اردو نے
ادب سے نام لیا ہے جنابِ رفعت کا

○

لبِ ادب پہ ہے رنگین ترانۂ رفعت
سنا رہا ہے زمانہ فسانۂ رفعت
دیارِ علم میں لٹتا ہے جس قدر راہی
زیادہ ہوتا ہے اتنا خزانۂ رفعت

○

زبان و شعر پہ روشن ہے عظمتِ رفعت
عیاں ہے فکر کے چہرے سے شوکتِ رفعت
ہزار عالم و فاضل ہیں حیار سو لیکن
کسے نصیب ہے دنیا میں رفعتِ رفعت

ان قطعات کے بارے میں رائے عالیہ سے نوازیئے۔

..... آپ کی دُعا سے مجھے ترقی مل گئی ہے اور میں بفضلِ خدا ریڈر ہو گیا ہوں۔ اہلیہ محترمہ کی خدمت گرامی میں تسلیمات اور بچوں کو دعائیں فرمایئے۔ خدا حافظ۔

محتاجِ دُعائے خیر! آپ کا شاگرد
خاکسار
راہی قریشی

گر بوئے گُل نہیں، نہ سہی، یادِ گُل تو ہے

ابوہاشم سیّد یوشع

عُمر خالدی

ابوہاشم سیّد یوشع ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی سے ۱۹۲۷ء میں بی۔ اے کیا اور ۱۹۳۰ء میں جامعہ مدراس کے شعبہ عربی، فارسی و اردو میں استاذ مقرر ہوئے۔ اسی جامعہ سے ۱۹۶۳ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ آپ کی فارسی دانی مسلّم ہے۔ آپ نے چند نمایاں فارسی مخطوطات کو مرتب کر کے جامعہ مدراس سے شائع کیا جس کی سن واری فہرست حسبِ ذیل ہے:

۱: فتوح السلاطین از عصامی جو شاہ نامہ ہند بھی کہلاتا ہے۔ یہ کتاب ایک طویل رزمیہ نظم ہے جو تاریخ ہند از دور محمود غزنوی تا دور محمد بن تغلق پر محیط ہے۔

۲: دیوان اوحدی مراغی [۶۸۰-۷۳۸] – ۱۹۵۱ء

۳: دیوان عبید زاکانی [۱۳۰۰-۱۳۷۱] ۱۹۵۲ء

۴: فتح نامہ محمود شاہی از عیانی بیدری۔ محمود شاہ ثانی بہمنی کے فتوحات پر مشتمل ہے۔

۵: کنز الغوائد از مستین محمد شاہ شہاب انصاری بہ عہدِ علاء الدین خلجی مرتب ہوئی۔ ۱۹۵۶ء

۶: تیمور نامہ از عبد اللہ ہاتفی [م ۱۵۲۱/۱۰۲۰] تیمور لنگ کی تاریخ ۱۹۵۸ء ہے

اس کے علاوہ آپ کی اولین تصنیف حافظ شیرازی۔ [۷۲۶ھ - ۷۹۱ھ]

ذیل کی کتابیں / مخطوطات آپ نے مرتب کی ہیں مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

۱: تاریخ شاہ جہانی از فرید بھکری بھکاری۔
۲: بادشاہ نامہ از ارادت خاں۔
۳: منتخبات از جوامع الحکایات از عونی۔
۴: وقائع محمد شاہ بادشاہ از نادر شاہ۔
۵: شگرف نامہ از اعتصام الدین۔
۶: تاریخ خان جہانی از عباس سروانی۔

تلاش بسیار کے باوجود حضرت یوشع مرحوم کے مضامین کے حوالے سوائے ایک کے اور نہیں ملے۔ واحد انگریزی مضمون یہ ہے:۔

"ARABIA AND ITS EARLY CONTACTS WITH INDIA"
ANNALS OF THE ORIENTAL RESEURCH, UNIVERCITY OF MADRAS, VOL. 13 [1957] 147-59.

اس "مجہول الحال" ہستی سے متعلق معلومات کی تشنگی کا افسوس ہے۔ بہت دریافت کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ مذکورہ حاصل شدہ علمی کاموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے جن کی یاد باقی ہے۔ مقام اور تاریخ انتقال کا علم نہ ہو سکا۔ کسی واقف کار نے انتقال کا سن ۱۹۸۳ء بتایا۔ حقیقتِ حال اور دیگر احوال سے اللہ ہی باخبر ہے۔

ڈاکٹر ابوالنصر محمدؒ خالدیؒ

دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے

[خواجہ معین الدین عزمی]

اب سے کوئی چھتیس سال پہلے اواخر ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ تاریخ اور مہینہ تو یاد نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ایک روز افضل العلماء مولانا سید عبدالباقی شطاری علیہ الرحمۃ نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے فرمایا اور ہم دونوں دبیرپورہ ریلوے اسٹیشن سے لوکل ٹرین کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ اسٹیشن پر اُترے۔ وہاں سے اٹرلوس راستہ پیدل طے کر کے انجینیئرنگ کالج کے عقبی حصہ میں واقع ایک مکان پر پہنچے جہاں محترم خالدی مرحوم رہا کرتے تھے۔ میرا تعارف انٹر کے ایک طالب علم اور خانگی استاد کی حیثیت سے کرایا گیا۔ کیسے معلوم تھا کہ یہ پہلی ملاقات آگے چل کر گہرے اور اٹوٹ تعلقات میں تبدیل ہو جائے گی۔ میں اپنے کرم فرما شناساؤں سے موصوف کے بارے میں فارابی کے نام سے غائبانہ متعارف تھا جس پر ستائشی انداز میں قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ چار بھائیوں میں کس طرح محترم خالدی مرحوم نے نکبت و افلاس، فقر و فاقہ کی گود میں پرورش پاکر مشکلات کے تلوں کو اولوالعزمی کے تیشوں سے پاش پاش کیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنا نام روشن کیا۔

اس ناچیز کو علامہ سید عبدالباقی شطاری علیہ الرحمۃ سے کب اور کس طرح نیاز حاصل ہوا اس کی تفصیل یہاں بے محل ہے البتہ تعارف کی غرض و غایت کے سلسلے میں چند سطریں اپنے بارے میں ناگزیر معلوم ہوتی ہیں۔ میرے والد مہاراجہ سرکشن پرشاد کے دورِ وزارت سے صدر اعظم کی پیشی کے اسٹاف سرجن رہے اور سر مرزا اسماعیل کے ابتدائی دور میں انتقال فرما گئے۔ کم عمری میں یتیم

ہوگیا اور دو سال میں یسیر بھی! یہ ننگِ خاندان، بدنام کنندۂ نکو نام چھٹی جماعت کی طالب علمی سے ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا جو آئندہ میرے لیے پیشہ بن گیا۔ مجھے مولانا کے بچوں کو بھی پڑھانے کی عزت حاصل ہوئی۔ استاذی شطاری (رحمۃ) کی ذرہ نوازی کہ خاکسار سے حسنِ ظن رکھتے تھے اور اس ہیچمداں کی پڑھائی اور طریقۂ تعلیم و تفہیم کو استحسان اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خالدی محترم سے چند ایک ملاقاتوں کے بعد بچوں کی خانگی تدریس طے پائی۔ یہی بات شرفِ ملاقات کی وجہ بنی۔ اس طرح ۱۹۵۴ء سے آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا ان کے سبھی لڑکے اور لڑکیاں ثانوی درجہ تک خاکسار کے زیرِ تعلیم رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ روابط بھی استوار ہونے لگے۔ اس کے علاوہ اس وقت سے قریباً تمام علمی اور تحقیقی کاموں میں آں محترم کا معین و مددگار رہنے کا اس بندۂ عاجز کو اعزاز حاصل رہا ہے! اسے کرمِ الٰہی کہیے کہ ناکارہ زندگی کا کچھ حصہ مفید علمی خدمت میں گزرا۔

ساڑھے تین دہے پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو دوسری ہی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ نہ ویسے لوگ رہے اور نہ وہ انسانی و تہذیبی اعلیٰ اقدار! نہ وہ آدابِ معاشرت دکھائی دیتے ہیں اور نہ ویسی اخلاقی قدریں! اساتذہ، والدین اور بزرگوں کی عزت و احترام کی اعلیٰ قدریں مٹتی جارہی ہیں۔ تعلیمی ڈھانچے بدل رہے ہیں۔ نظامِ معاشرت اور عروسِ تہذیب نئے نئے چولے بدل رہی ہے۔ صداقت، عدالت، شرافت، شجاعت کے جدید معنی کچھ اور ہیں۔ مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ خالدی محترم کے حالاتِ زندگی قلم بند کردوں۔ بھلا یہ کام! اس کم سواد کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو ان اہلِ قلم حضرات کا فریضہ اور ذمہ داری ہے جنھیں شخصیات نگاری اور سوانح عمری سپردِ قلم کرنے پر دسترس حاصل ہو اور وہ حقیقی معنی میں "مقامِ خالدی اور ان کے علمی مرتبہ" کا کما حقہٗ علم رکھتے ہوں جن کا اشہبِ قلم قرطاسِ ابیض پر اپنی رفتار و گفتار کی جولانیاں دکھاتا ہو تو لطفِ مطالعہ بھی حاصل ہوگا اور طرزِ ادا اور

اسلوبِ نگارش کے مزے بھی لوٹ سکیں گے۔ مجھ بے بساط سے تو توقع نہیں کی جا سکتی کہ میں اس سلسلہ میں موضوع سے پوری طرح انصاف کر سکوں گا۔ جو کچھ بھی میرا قلم لنگڑاتے لکھے یہی عرض کر دوں گا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

میری پیدائش رودِ موسیٰ کے کنارے ہوئی۔ بچپن وہیں گزرا۔ ایسی زبان لکھ نہیں سکتا جس میں چشمۂ شیریں کا زیر و بم ہو یا شبنم کا رقصِ نم۔ اس میں آپ کو نہ تتلی کا رقصِ ناز نظر آئے گا نہ غزالہ کا حسنِ رم۔ نہ الفاظ میں موتی کی آب ملے گی نہ بیان میں گُل کی مہک! مجھے اپنی بے بضاعتی اور ہیچمدانی کا پوری طرح احساس ہے۔ بات جب یادِ رفتگاں کی ہے تو کہیں دیدۂ تر ہوگا تو کہیں آہِ سرد!

زخمِ دل پھر کسی نے چھیڑ دیا ؛ آج آنسو ہیں کچھ گلابی سے

اگر قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند ہو تو پھر کم و بیش بیس سالہ رفاقت کا قرض چکانے کا فرض ادا کرنا ہی پڑے گا۔ مجھے اتنا تو بتانا ہوگا کہ محترم خالدی کون تھے؟ کیا تھے؟ کیسے تھے؟ اور کیا کئے؟ مختصر جواب یہ ہوگا کہ ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی "میرے خسر تھے" استاد تھے" (اگرچہ کہ درساً درساً کوئی کتاب نہیں پڑھا لیکن کچھ نہ کچھ تو سیکھا) "جامعہ عثمانیہ میں تاریخ اسلام پڑھاتے تھے"۔ "نیک اور شریف انسان تھے" اور آخری سوال کا جواب یہ ہے کہ "مضامین لکھے، مقالے لکھے، کتابیں لکھیں، ترجمے کئے، قرآن فہمی کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ مطالعۂ قرآن کی ذوق پروری بھی کئے"۔ چلئے بات ختم۔ قصہ تمام۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے کلام مجید کے احسن القصص میں حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے تذکرہ کا خلاصہ کہ مردے بود، پسرے داشت، گم شد، بازیافت یعنی ایک صاحب تھے، ان کا ایک بیٹا تھا، وہ کھو گیا، پھر مل گیا۔ اس قدر اختصار بھی کس کام کا کہ بات بیان تو ہوئی مگر پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں کی تشنگی برقرار! اسی "کون ہے" اور "کیا ہے" کا جواب اپنی کج مج زبان میں پیشِ خدمت ہے۔ طالب علم ہوں کہیں اسلوبِ زبان

اور طرزِ بیان میں بے ربطی پائیں تو راقم الحروف کی نا اہلی سمجھ کر نظر انداز فرمادیں۔ میں اجمالاً انہی باتوں کا ذکر کروں گا جو میری دانست میں ضروری معلوم ہوں۔ مختصر مضمون میں تمام امور کا احاطہ مشکل ہے۔ یہ سرگزشتِ حیات کے چند اوراق جہاں سوز و تیمور کی داستان یاد دلائیں گے وہیں دعوتِ فکر و عمل اور جہدِ مسلسل کا پیام بھی دیں گے۔ علماء اور صالحین کی صحبت کی تاثیر کے جلوے دکھائیں گے تو "یقین محکم" "عمل پیہم" کی کامرانیاں بھی!

ہمیں بہت کم خاندان ایسے ملیں گے جن کو اپنی سابقہ تین چار پشتوں سے زیادہ کی معلومات ہوں۔ پچھلی تین چار پشتوں سے متعلق بھی بعض کو صرف ناموں ہی کا علم ہوتا ہے اِن کے پیشے، مشاغل اور دیگر احوال سے واقفیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ ہر چند کہ بعض کے یہاں تحریری طور پر یا سینہ بہ سینہ سلسلۂ نسب کے مکمل معلومات محفوظ ہوں۔ بہرحال زیادہ تفصیلات میں گئے بغیر محترم خالدی مرحوم کے آباد اجداد کے بارے میں اس حد تک علم ہے کہ وہ لوگ چودھویں صدی عیسوی میں محمد بن تغلق کے عہد میں چودہ سو پالکیوں کے ساتھ دکن کا رخ کئے تھے اور اکثر کا تعلق اہلِ سیف سے تھا۔ چنانچہ نواب ناصر الدولہ (۱۸۲۹ء ۱۸۵۷ء) کے دور میں آپ کے جدِ اعلیٰ عبداللہ حیدر خان فوج میں سلحدار تھے۔ کسی وجہ سے انھوں نے فوج کی ملازمت ترک کردی اور اس واقعہ سے اہلِ خاندان کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عبداللہ حیدر خان کے بیٹے حسین خان تھے اور حسین خان کے لڑکے کا نام محمد علی تھا جو سیاہ فام ہونے کی وجہ سے کلن خان یا کالے خان کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ جو کچھ پونجی کمائی تھی اس سے حج کے لیے روانہ ہوگئے۔ ۱۸۷۰ء میں حج سے واپس ہونے کے بعد کاروبار چھوڑ دیئے اور توکل کی زندگی بسر کرنے لگے۔ عزیز و اقارب، دوست احباب حاجی صاحب یا کالے شاہ کے نام سے پکارتے تھے۔ کالے شاہ کے دو لڑکے تھے۔ ایک کا نام محمد حسین خان تھا اور دوسرے کا احمد خان۔ یہی محمد حسین جناب خالدی کے والد بزرگوار تھے جنھوں نے اپنے بڑے کنبے کی پرورش اور گزر

بسر کے لیے جلوخانہ سے قریب لارڈ بازار (چار مینار) میں ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی۔ ان کے ذکور و اناث ملاکر چودہ بچے۔ جن میں آٹھ بچے خوراک کی کمی یا طبی سہولتوں کی عدم موجودگی کے باعث پیدا ہوتے ہی اور بعض شیر خواری میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بقیدِ حیات سلامت رہنے والوں میں ترتیب وار غلام محی الدین (خوشنویس سنٹرل ریکارڈ آفس)، محمد سیف الدین عرف غلام غوث خان (لکڑی کے استاد، ماہر بنوٹ اور جدید اصطلاح میں فزیوتھراپی سے واقف) محمد شرف الدین (جو ابوالنصر محمد خالدی کے نام سے مشہور ہوئے) اور غلام محمد۔ درمیان میں دو بہنیں تھیں تھوڑی سی عمر پاکر انتقال کر گئیں۔ سکونت کوچۂ صورت سورت قریب پرانا پل۔ دکان کی آمدنی قلیل اور عیال کثیر۔ ولی صفت آدمی۔ چھوٹی دکان کی چھوٹی آمدنی، بمشکل سے صبر و شکر کے ساتھ گزر بسر ہوتی!

اس کائناتِ رنگ و بو اور عالمِ بے ثبات میں بہت سی زندگیاں ایسی نظر آئیں گی کہ بھوکوں مریں مگر منہ سے کچھ نہ بولیں۔ فراغ دستی کا گزر نہیں، تنگدستی کا بول بولا۔ عسرت و تنگی کا یہ عالم کہ جو من بھاتا کھا نہیں سکتے، جو دل چاہتا پہن نہیں سکتے۔ لب پہ شکر، چہرے پہ مسکراہٹ مگر آنکھوں سے فریاد آشکار "خانۂ حسین" کا حال بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ غریب ہونا کوئی جرم نہیں لیکن غربت میں نام پیدا کرنا کمال ہے۔ حمیت و خودداری برقرار رکھنا ایک اعجاز ہے۔ مفلسی یا تونگری تو وقت اور بخت کی دین ہیں۔ وائے افسوس! ان کا غربت و افلاس بھی کیسا، دورِ پیغمبری سے کم نہیں! روز نیا روزی نئی۔ جتنی آمدنی ہوتی اس کے مطابق ہانڈی چڑھتی۔ بسا اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ کھانا اتنا پکا کہ سب کے لیے ناکافی۔ چند ایک آپس میں چند لقمے بانٹ لیے جو نہ کھا سکے وہ پیٹ پہ گزارا کرلیا اور حرفِ شکایت زباں پہ نہ آیا۔ عجیب تصویرِ درد کا عالم! اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (سورۃ ابراہیم ت ۷)

صبر سے کام لیا کہ فرمانِ الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (سورۃ البقرہ۔ آیت ۱۵۳) دن طلوع ہوتا تو نئی شان کے ساتھ اور رات آتی تو اک نئی آن کے ساتھ! فاقہ مستی کے یہ جوہر، تسلیم و رضا کے یہ پیکر ہمیشہ اللہ کی رحمت کے منتظر! دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ہوتا ہے۔ پڑھیے روئداد قطرہ سے گہر ہونے تک۔

مختار الملک سالار جنگ اول کے عہد میں مختلف پیشہ ور لوگ شمال اور وسط ہند سے بہتر روزگار کی تلاش میں حیدرآباد دکن آنے لگے۔ انھیں میں ایک راجپوت مسلم الٰہی بخش ماہر تیر انداز تھے جنھوں نے بہ آسانی فوج میں معقول مشاہرہ پر ملازمت حاصل کرلی۔ ان کے لڑکے غلام رسول خان کو بھی خاندانی پیشہ تیر اندازی میں مہارت کے طفیل فوج میں اچھی خدمت مل گئی۔ اب غلام رسول خاں کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس دور میں حیدرآبادی باہر سے آنے والوں کے ساتھ اپنی بیٹیوں کا رشتہ کرنے سے گھبراتے تھے کیوں کہ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اس طرح باہر سے آنے والے موسمی پرندوں سے کم نہیں، ڈال کے پنچھی نہ جانے کب چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ جائیں۔

حسنِ اتفاق سے ایک ولایتی عرب (یعنی حضر موت کا باشندہ، جن کی بیوی حبشی نژاد تھی) کی بیٹی ان بیاہی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کی شادی غلام رسول خاں سے کردی۔ ایک مدت تک انھیں اولاد نہیں ہوئی۔ انھوں نے خواہش کر کے محمد حسین کے فرزند اور کالے شاہ کے پوتے محمد شرف الدین (جن کا نام پہاڑی شریف کے بزرگ بابا شرف الدینؒ کے نام پر رکھا گیا تھا) عرف شرفو میاں کو گود لے لیا۔ اب یہ اپنے پالن ہار والدین کے پاس رہنے لگے۔

محترم خالدی مرحوم کی ابتدائی تعلیم مقامی درس گاہ میں ہوئی۔ رضاعی خالو رحیم الدین مرحوم سے اِتنی اردو سیکھ لی تھی کہ فارسی شروع کرنے کے قابل ہوگئے۔ درجہ ہفتم کے فارسی نصاب کی حد تک استعداد پیدا کرلی۔ ابھی نوخیز پودے کی کونپلیں پوری طرح پھوٹنے نہ پائی تھیں کہ پودے کی قسمت پھوٹ

گئی۔ چمن میں آبیاری کرنے والا ہی نہ رہا۔ بہاریں اپنی آمد سے پہلے ہی رخصت ہوگئیں۔ بجلیاں گھات میں تھیں شاخِ نشیمن جلا ڈالیں! تین چار سالہ سرپرستی کے بعد اس فرزندِ آغوشی کے منہ بولے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

رضاعی والد کے انتقال کے بعد وہ اپنے حقیقی والدین کے ہاں واپس آگئے اور مسجد میاں مشک (پیرانا پل) کے مدرسہ دینیہ کے استاد ابوالفضل شرف الدین مرحوم کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

آغاز عمر ہی سے آزمائشوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ نامساعد حالات نے سلسلۂ تعلیم منقطع کرنے پر مجبور کیا۔ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ والدین کا گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر اللہ کے گھر مسجدِ چوک کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ شوقِ علمی کی چنگاریاں ابھی بجھی نہ تھیں۔ وہ ابھی راکھ تلے پوشیدہ تھیں۔ خرد کی بجلیاں یادلوں میں آسودہ تھیں۔ ضرورت تھی کہ کوئی راکھ کے ڈھیر کو کرید سے اور یادلوں کو ٹٹولے! دیکھئے اللہ کے گھر میں کون فرشتہ پلتا ہے۔ مرحوم زندگی کی آسودگیوں سے محروم مسجد کے ایک تاب دان میں اپنی کتابیں رکھتے۔ یہیں پڑھتے اور یہیں سو جاتے۔ کتابوں کے علاوہ دکھ کے ساتھی اور درد کے شریک ان کے جلیس اور انیس، ہمدم و رفیق دیرینہ سید عمر قریشی (م ۱۹۸۴ء) بھی ساتھ رہتے اور ساتھ پڑھتے تھے۔ ایک عرصہ بعد حالات بہتر ہونے پر دونوں نے مل کر مسجد کا ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے۔ یہیں اس دور میں مکتبِ داغ دہلوی کے ممتاز اور شہرۂ آفاق استادِ سخن حکیم میر بہبود علی صفی اورنگ آبادی (۲۵ رجب ۱۳۱۰ھ ۱۵ رجب ۱۳۷۳ھ) کو بھی حالات کی آندھیوں نے مسجد چوک میں ڈھکیل لایا۔ وہ بھی نامعلوم وجوہات کی بناء پر والد کا گھر چھوڑ کر

پہلے تو مدرسہ نظامیہ میں شریک ہوئے اور پھر دوست احباب کے ہاں رہنے لگے۔ اس کے بعد مسجد چوک اور اس کا کتب خانہ ان کے لیے مسکن اور مکتب بن گیا۔

خانہ بدوشیوں کا صفیؔ کی شمار کیا
مسجدیں ہیں کبھی تو کبھی خانقاہ میں

صفیؔ مرحوم کی شخصیت اردو ادب اور اردو شاعری میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حصولِ علم میں کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کی بجائے کُتب بینی کے ذریعہ خود ہی اکتسابِ علم و فن کیا۔

مجھے بھی صفیؔ اورنگ آبادی کے آخری دَور میں خدمت میں حاضر ہونے اور شرفِ نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ انھیں اکیلا بھی سُنا اور مشاعروں میں بھی۔ صفیؔ اورنگ آبادی کی خداداد ذہانت، قوی حافظے اور کُتب بینی کے ذریعہ اکتسابِ علوم و فنون کی صلاحیت پر ڈاکٹر سیموئل جانسن [۱۷۰۹ء-۱۷۸۴ء] یاد آیا۔ انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہوں گے کہ ڈاکٹر سیموئل جانسن ایک کُتب فروش کا بیٹا تھا۔ باپ اسے دکانداری کرنے کے لیے چھوڑ جاتا تو وہ بجائے گاہکوں سے نمٹنے کے اپنا سارا وقت دکان میں موجود ہر قسم کی کتابوں کے مطالعے میں گزارتا اور اسی کتب بینی کے طفیل اِس نے اپنی ذہانت اور ذکاوت سے اِتنی علمی قابلیت اور استعداد پیدا کر لیا تھا کہ تعلیم یافتہ اس کی علمیت اور صلاحیت کا لوہا مانتے تھے۔ یہی حال صفیؔ اورنگ آبادی کا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ٭ تانہ بخشد خدائے بخشندہ!

ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنا ہو تو اہلِ ذوق اور سخن شناسوں کے لیے

۱؎ انتخاب کلام صفیؔ اورنگ آبادی۔ سید سیار الدین رفعت مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ء

۲: "پراگندہ" مرتبہ خواجہ شوق مطبوعہ ۱۹۶۵ء
۳: "فردوس صفی" " سید غوث یقین (کراچی)" ۱۹۶۸ء
۴: "گلزار صفی" " روٴف رحیم مطبوعہ ۱۹۸۷ء
۵: سوانح عمری صفی اورنگ آبادی نواب نورالدین خان " ۱۹۸۹ء
۶: تلامذہ صفی اورنگ آبادی محبوب علیخان اخگر قادری" ۱۹۹۱ء

موجود ہیں۔ اس کے علاوہ "مرقع سخن" اور دیگر مختلف رسالوں میں لکھے گئے مضامین اور مقالے بھی ہیں۔

محترم خالدی کی ۱۹۲۶ء میں اس نیک نفس سلیقہ مند، صفائی پسند خوددار اور لاابالی شخصیت سے پہلی ملاقات کا واقعہ ان ہی کی زبانی اس طرح ہے:

"ایک دن میں کتب خانہ کی کسی قدیم کتاب کے شکن آلود اوراق کو حوض کے پتھر پر بیٹھے کپڑا بھگو کر درست کر رہا تھا۔ "ایک صاحب" نہ جانے کب سے میری مصروفیت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ کام ختم ہونے کے بعد وہ "صاحب" قریب آئے اور مسکرا کر مجھ سے یوں خطاب کیا "اگر تم لڑکی ہوتے تو میں تم سے شادی کر لیتا۔" بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ صاحب صفی اورنگ آبادی ہیں"۔
[اس کا حوالہ "سوانح عمری صفی اورنگ آبادی مرتبہ محمد نورالدین خاں صاحب مطبوعہ ۱۹۸۹ء حیدر آباد۔ میں بھی صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں]

مذکورہ واقعہ سے ہر دو کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ایک کی طبعیت میں صفائی اور سلیقہ مرغوب تو دوسرے کے مزاج میں نفاست اور حسن محبوب۔

وقت اور محنت کے ہاتوں دونوں کا ٹھکانہ اللہ کا گھر ہے

کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے
شب کو ایک آواز آتی ہے الٰہی! کیا کروں؟ (صفی)

چند ایک ملاقاتوں کے بعد حضرت صفی کی قلندر صفت، مردم شناس شخصیت نے آپ کی ذہانت اور علمی شغف دیکھ کر اردو اور فارسی ادب کی مروجہ کتابوں اور شعراء کے مجموعہ کلام کو ان سے پڑھنے اور سیکھنے کی ترغیب

دی۔ اسی مردِ دانا کی تعلیم و تربیت سے اردو اور فارسی میں نہ صرف سابقہ استعداد کو جلا ملی بلکہ صلاحیتیں اور اُبھر آئیں۔ انھوں نے استادانہ شفقت، مہر و محبت سے خضرِ راہ بن کر جناب خالدی کو تعلیمی دھارے سے ہٹنے نہیں دیا اور ہر وقت ہر طرح سے ہمت افزائی کرتے رہے۔ مثل مشہور ہے: ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ چناں چہ مدرسہ دارالعلوم میں شرکت حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۲۸ء میں میٹرک کامیاب کئے۔ اسی جذبۂ شوق، محنت و جستجو، صلاحیت، اور کامیابی سے متاثر ہو کر حضرت صفیؔ نے "ابوالنصر" کا خطاب دیا۔ اسی کنیت کی نسبت سے احباب اور شناسا "فارابی" پکارنے لگے۔ دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہونے کے بعد بھی اپنے قدیم حلقے میں ایک عرصہ تک "فارابی" کے نام سے مشہور رہے۔ آگے چل کر تاریخ اسلام سے غیر معمولی دلچسپی اور ہمت و حوصلہ، جہد مسلسل دیکھ کر ایک اور استاد نے مجاہدِ اسلام سپہ سالارِ اعظم حضرت خالد بن ولیدؓ کی نسبت سے "خالدی" کے خطاب سے نوازا۔ اس طرح والدین کا دیا ہوا اصل نام محمد شرف الدین سعی اور عمل میں شرف حاصل کرنے اور طلبِ علم کی جادہ پیمائی میں کامیابی اور نصرت کے بعد ان خطابات کے پردوں میں گم ہو گیا اور وہ ابوالنصر محمد خالدی ہو گئے۔

وقت نے کروٹ بدلا۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد دریائے حیات کی حوصلہ شکن پرشور موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر منجدھار سے سفینہ بچا کر ساحلِ مراد کو پہنچے اور ۱۹۳۴ء میں بی۔ اے کی منزل پار کر لی۔ اس دوران کیا کیا نہ سہے اس نے ستم کچھ نہ پوچھئے! حصولِ تعلیم کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے طرح طرح کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے مغلوب ہوئے بغیر اپنی دھن اور علم کی سچی لگن میں چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ بہت کچھ ہوا لیکن بگڑے حالات کی آندھیاں ان کے مشعلِ شوق کو بجھا نہ سکیں ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

اسی زمانے میں جسم و جان اور قرطاس و قلم کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے طلباء کو گھروں پر پڑھایا کرتے تھے۔ چنانچہ سید قطب الدین احمد محمودیؒ سحر (م ۲۲؍ فروری ۱۹۶۳ء بمقام کراچی) لکچرر چادر گھاٹ کالج (پسر حضرت سید شاہ محمود مکی علیہ الرحمۃ م ۵؍ محرم ۱۳۳۸ھ) نے اپنے دو صاحبزادوں، سید شجاع الدین حسین (م ۳۱؍ جنوری ۱۹۸۸ء) اور حکیم سید رفیع الدین حسن کی تعلیم اپنے عزیز شاگردِ رشید خالدی محترم کے ذمہ کی تھی۔ ان کی پڑھائی اور قابلیت کی تعریف سن کر سید قطب الدین احمد محمودی کے حقیقی بہنوئی سید نظام الدین مرحوم (م ۳؍ ڈسمبر ۱۹۳۹ء) امین جنگلات نے اپنے صاحبزادہ سید مبارز الدین رفعت (۱۹۱۸ء - ۱۹۷۶ء پرنسپل مہارانی کالج میسور) کی نہ صرف تعلیم کے لیے مقرر کر لیا بلکہ اپنے مکان (موقوعہ قاضی پورہ) کے بالاخانہ میں رہنے کی اجازت بھی دے دی۔ گویا یہ ہاتف غیبی کی آواز تھی یا مسبب الاسباب کا پیغام ؎

نشیمن پر نشیمن اس طرح تعمیر کرتا جا
کہ بجلی گرتے گرتے آپ ہی بیزار ہو جائے

بی۔ اے کر لینے کے بعد کسی نے ایل ایل بی کرنے کا مشورہ دیا تو کسی نے کچھ اور لیکن خالدی محترم کو تاریخ اسلام سے ام۔ اے کرنے کا جذبہ اور ولولہ تھا جس کے لیے فارسی یا عربی زبان میں خاطر خواہ لیاقت ضروری تھی۔ تحصیلِ علم کے اس کرب و اضطراب کو فارسی اور عربی میں سید قطب الدین احمد محمودیؒ کے شرفِ تلمذ سے قرار آہی چکا تھا۔ یہاں ان کے مضمون "جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد" سے اقتباس قلم بند کیے بغیر آگے بڑھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ تحریر فرماتے ہیں :-

"بی۔ اے میں عہد سلاجقہ سے کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ ام۔ اے میں تاریخ اسلام لینے کا پختہ ارادہ ہو گیا۔ اس زمانے میں یہ مضمون اختیار کرنے کے لیے عربی در نہ فارسی کی قابلیت لازمی تھی اور یہ قابلیت اس ناچیز میں ....

...... یہ حقیر فقیر سراپا تقصیر اس مکان کے بالاخانہ میں پڑا ہوا علم کی طلب میں سرگرداں رہتا تھا ...."

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ ؞ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس فکر و تردد کا علم ہونے پر سید نظام الدین مرحوم نے آپ کو متبحر عالم مولوی جمیل الدین احمد مرحوم (م ۱۹۵۶ء) کی شاگردی میں تفویض کیا۔ یہ مولوی صاحب منصف مجسٹریٹ (اورنگ آباد) تھے جن کا نام پہلے رائے جگناتھ پرشاد (فرزند رائے بھوانی پرشاد) مسلم نام غلام محمد تھا۔ محلہ بازار روپ لال میں اونچی کرسی والے سفالی مکان میں رہتے تھے۔ وہ فارسی اور عربی میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ بعد میں ان کا نام مشاہیر علمائے دین اور اہل اللہ میں ہونے لگا۔ وہ مبلغِ دین تھے اور ان کے گھر پر روزانہ بعد نماز فجر تفسیر اور درس قرآن ہوا کرتا تھا اور عشاء کی نماز کے بعد مسائلِ تصوف پر ایمان افروز تقریریں۔ درس میں اہلِ علم بھی رہتے تھے اور طالب علم بھی۔ انہی کے فیضِ تعلیم سے بیسیوں بدعقیدہ گمراہوں نے راہِ ہدایت پائی۔ ۱۹۴۸ء میں انجمن احیاءِ دین اور مدرسہ حفاظ قائم کیا جس کا ثواب جاریہ اب تک زیبِ دوراں ہے۔

خالدی محترم نے سنگ میل کو اپنی منزل نہیں سمجھا بلکہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب بلا کھٹکے ام۔ اے میں داخلہ لے لیئے اور اس طرح بلند روشنی کے میناروں نے منزل بہ منزل راہ دکھائی۔ وہ مولوی جمیل الدین احمد مرحوم کا ذکر "راجہ حضرت" کے نام سے کیا کرتے تھے۔ ان کے شب و روز "راجہ حضرت" کے فیضِ صحبت اور ہم نشینی میں گزرنے لگے۔ کتابِ زیست میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ ارادے مچلنے لگے، امنگیں کروٹیں لینے لگیں۔ آرزوؤں کی چنگاریاں دہکنے لگیں۔ دل کو روحانی انبساط کی تشنگی تو دماغ کو علمی خزانوں کی فکر! چلیئے "راجہ حضرت" کے مدرسہ کی جھلک دیکھتے ہیں۔

پہلے دن بعد بسم اللہ آغازِ درس کا پہلا جملہ "منت خدائے عزّوجلّ

کہ طاعتش موجب قربت است" قربت کے معنی دریافت کرکے غور کرنے کے لیے فرمایا اور پہلے دن کا سبق ختم۔ دوسرے دن قربت پر تقریر فرمائی تیسرے دن کے بعد گلستاں کا درس شروع ہوا۔ گل خوشبوئے در حمام روزے.... تا آں کی تشریح و توضیح ایسے معنی افروز انداز میں ہوئی کہ حال کی عجیب کیفیت طاری ہو گئی "قدرت قادر کی!" ہوش در دم نظر بر قدم، سفر در وطن، خلوت در انجمن، یہ رہے ابتدائی عنوان۔ اللہ ہی علیم و خبیر ہے کہ دینے والے نے کیا کیا دیا اور لینے والے نے کیا لیا۔ راز و نیاز کی باتیں اللہ ہی جانے۔ ایسے علم سینہ بہ سینہ کو سفینہ سے کیا تعلق ؟!

ع خدا کی شان ایسے بھی ہوتے ہیں بشر دیکھو

اس طرح "راجہ حضرت" نے دامے، درمے، قدمے، سخنے، قلمے حسب ضرورت جو بھی بن پڑا اعانت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ تحدیث نعمت کے طور پر محترم خالدی نے "جمالِ ہم نشین در من اثر کرد" لکھ کر گلہائے عقیدت پیش کیے۔ جب علم سلوک و معرفت میں تجسس بڑھنے لگا بالآخر کچھ عرصہ بعد شیخ محمد حسینؒ (م ۱۹۴۵ء) ناظم عدالت سمستان ونپرتی سے بیعت ہو گئے جو حضرت مچھلی والے شاہؒ (م ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء) کے خلیفہ تھے۔ ع

کرم کردی الٰہی زندہ باشی!

تدبیر نے تقدیر کی الجھی زلفیں سنواریں تو دعاؤں نے اس کا حسن نکھارا۔ آپ نے ۱۳۴۵ف م ۱۹۳۶ء میں تاریخ اسلام سے ایم اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ سید نظام الدین مرحوم (حضرت سید شاہ محمود مکیؒ کے داماد) اپنے مکان کے بالاخانہ میں رہنے والے ٹوٹی کشتی کے ناخدا اور قدم قدم پر مشکلات کا جوانمردی سے مقابلہ کرنے والے کی زندگی کا مشاہدہ کر رہے تھے، خالدی محترم کے سعادت آثار، ستودہ اطوار نیک عادات اور مضبوط کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنی

بڑی صاحبزادی خیر النساء زبیدہ سے بتاریخ ۲۶ر شعبان ۱۳۵۷ھ م ۲۱ر اکتوبر ۱۹۳۸ء بروز جمعہ ان کی شادی کردی جب کہ خانگی تدریس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ آمدنی نہ تھا۔

سید نظام الدین مرحوم کے اسلاف میں جہاں سلسلۂ طریقت اور مشائخ عظام کا رنگا رنگ گلدستہ تھا وہیں اپنی اہلیہ کی طرف سے اکابرین رُشد و ہدایت اور بزرگانِ دینِ طریقت کا جھومر! ان کے سلسلۂ نسب کے بارے میں صرف اتنا بتادینا کافی ہے کہ ان کے پُرکھوں کی بیجاپور میں آمد عادل شاہی دور میں ہوئی۔ بیجاپور میں "موتی گنبد" جہاں سید شاہ حبیب اللہؒ (م ۱۰۴۱ھ) آسودہ ہیں ان کے رفعتِ خاندان اور عظمتِ آباء کا ثبوت ہے۔ ایسے ماحول کی پروردہ اپنی "سیدزادی" دختر نیک اختر کا محترم خالدی کے ساتھ عقدِ ازدواج اس دور کی معاشرت اور اسلاف کی روایت کے خلاف ایک اہم اقدام اور غیر معمولی جراءت رِندانہ ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ عام طور پر شادی بیاہ میں یہ دستور رہا ہے کہ سیّد زادیوں یا سادات گھرانوں سے تعلق رکھنے والیوں کی شادی کبھی غیر سیّد سے نہیں کیا کرتے۔ سیّدوں کو یہ احساس کہ حسب نسب کے اعتبار سے انھیں دوسرے طبقوں کے مقابلے میں امتیاز اور برگزیدگی حاصل ہے۔ اس لیے ان سے رشتہ کرنا وقار کے خلاف اور شان کے منافی ہے۔ اسی طرح غیر سیّد بھی سیّد زادیوں سے شادی کرتے ہیں گھبراتے کہ کبھی بھولے سے بیوی کی دل آزاری ہو یا انھیں کوئی تکلیف پہنچے تو گھر کی یا خاندان کی بربادی ہو جائے گی۔ بہر حال خاندانی اختلاف رائے کے باوجود سید نظام الدین مرحوم کا یہ عمل روایات شکنی پر مبنی اور خاندانی اصولوں سے زبردست انحراف تھا۔ اس کے قطع نظر طبقاتی بیّن فرق بھی تھا اور مالی حیثیت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا تفاوت! اگرچہ کہ وہ زمانہ معاشی اعتبار سے ارزانی کا تھا لیکن سماجی لحاظ

سے لوگ اپنی آن بان کے لیے جان دینے تیار تو اپنی عزت و وقار کے لیے مر مٹنے آمادہ۔ اپنی بیٹیوں کی خوشحال زندگی کے لیے اونچے درجہ کے لوگوں میں نہ سہی تو کم سے کم برابر والوں میں رشتہ کرنے کا خیال کرتے۔ انھوں نے غالباً اس رشتہ کو شرافت، انسانیت اور علمیت سے تولا، امارت اور نجابت سے نہیں! تمام امور کو بالائے طاق رکھ کر اس کارنامہ کی انجام دہی ان کے انقلابی رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔ ممکن ہے اس رشتہ نے لوگوں کو حیران کرنے کے یا وصف چونکا بھی دیا ہو۔

مجھے اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد کے "تذکرہ" کی تمہید میں بیان کی ہوئی نکتہ آفریں بات یاد آئی۔ معلومات کے لیے اس کی چند سطریں سپردِ قلم کر دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

"اسلام نے ساری نسبتوں اور امتیازوں کو مٹا کر صرف ایک اپنی نسبت نوعِ انسانی کو عطا کی، اور اس نسبت سے بڑھ کر اور کونسی نسبت ہو سکتی ہے جس کی ایک مسلمان کو تلاش ہو؟ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ انسان کے لیے معیارِ شرف جوہرِ ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں! اربابِ ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت اور رفعت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ خاندان کے فخر کا بُت بھی دنیا کے عہد جاہلیت

کی ایک یادگارِ مشئوم ہے۔ اور اسلام نے انسان کے بہت
سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔"
("تذکرہ" از مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ مالک رام مطبوعہ ۱۹۸۱ء)

اگر سید نظام الدین مرحوم کی فکرِ رسا مذکورہ اسلامی فکر کے ہم آہنگ تھی تو ان کا عمل اور بھی لائقِ تحسین ہو جاتا ہے۔ راقم کے ہاں وسائل و معلومات نہیں کہ کس فکر و خیال نے اس کے لیے انھیں آمادہ کیا تھا۔ بہرحال اب سے نصف صدی قبل ان خطوط پر سوچنا ان کی جدت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان سے متعلق دو باتوں کا سرسری طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ماضی کے دھندلکوں میں چھپ گئے ہیں۔ امینِ جنگلات ہونے کی وجہ سے متعلقہ اضلاع کے دوروں پر رہا کرتے ایک دفعہ ان کے افسرِ اعلیٰ نے کسی سرکاری معاملے میں خلافِ قاعدہ و قانون رپورٹ لکھنے کا حکم دیا۔ آپ نے اس کے حسبِ منشاء ایسا کام کرنے سے انکار کر دیا جس سے ایک بے قصور کی حق تلفی ہوتی تھی۔ اصرار بڑھنے پر آپ نے بے ایمانی اور ضمیر فروشی کی بجائے ملازمت سے استعفیٰ دے کر اپنی عاقبت سنوار لی لیکن اس کی بات نہ مانی۔ خدا ترسی اور خشیتِ الٰہی نے انھیں دنیا سازی سے باز رکھا۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد واپس ہوئے۔ یہاں انھوں نے "اقبال برادرس" کے نام سے ایک کمپنی قائم کی جو جائیدادوں کے بیع و شرئ کے علاوہ مکانوں کی تعمیر کا بھی گتہ لیا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو غالباً آپ کی ایمانداری اور دیانت داری پسند آئی۔ ایسا فضل و کرم کا مینہ برسنے لگا کہ اس کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔

۳ر ڈسمبر ۱۹۳۹ء کی بات ہے یکایک قلب پر حملہ ہوا اور خالدی محترم کے یہ پاک طینت خسر صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ خسر صاحب کی گوناگوں شفقت اور اخلاص کی وجہ سے ان کے انتقال پر سخت صدمہ پہنچا۔ اپنے سسرالی گورستان درگاہِ حضرت سید محمود مکیؒ حسینی ٹیکری کشن باغ میں تدفین عمل میں آئی۔ جب خسر صاحب کی قبر کھُد کر تیار ہو گئی تو دفن سے

پہلے خالدی محترم قبر میں اُترے اور آنکھیں بند کر کے خود قبر میں لیٹ گئے۔ لوگ حیرانی سے یہ غیر متوقع منظر دیکھتے رہے۔ سب کے سب انگشت بہ دندان! یہ واقعہ میرا شنیدہ ہے۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ نہ انہوں نے کبھی اس کی وجہ بیان کی۔ اگر ان کا یہ عمل اتباعِ سنّت میں تھا تو یہ ایسی سنّت ہے جس سے صرف وہی واقف ہو سکتے ہیں جنھوں نے سیرتِ پاک کا بالاستیعاب اور گہرا مطالعہ کیا ہو۔ میں یہاں اپنے ماضی کی تاریخ اور سیرتِ طیبہ سے فراموش کردہ ورق کی یاد ذرا وضاحت کے ساتھ تازہ کروں تو یہ پہلو بھی باعثِ ایمان افروز ہوگا۔

مورخ ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کثیر چچاؤں میں صرف دو حقیقی چچا تھے یعنی حضرت زبیر اور حضرت ابوطالب جعفر ابوطالب (جن کا اصل نام عبد مناف تھا) کی شادی اپنی چچا زاد ہمشیرہ بی بی فاطمہ رضؓ بنتِ اسد بن ہاشم کے ساتھ ہوئی تھی جن کے بطن سے چار صاحبزادے (۱) طالب (۲) عقیل رضؓ (۳) جعفر رضؓ (۴) علی رضؓ تھے اور تین صاحبزادیاں ۱۔ ام ہانی رضؓ (زوجہ ہبیرہ بن ابووہب مخزومی) ۲۔ جمانہ رضؓ (زوجہ ابوسفیان رضؓ بن حارث بن عبدالمطلب) اور ۳۔ ربطہ رضؓ تھیں۔ حضور اکرم صلعم کی ۸ سال کی عمر شریف میں دادا حضرت عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ صلعم اپنے چچا ابوطالب کے زیرِ پرورش رہے تو ظاہر ہے کہ اپنی چچی سے بھی سابقہ رہا۔ اس بارے میں آپؐ ارشاد فرماتے ہیں "لم یکن احد بعد ابی طالب ابر بی منھا" (ابوطالب کے بعد مجھ پر ان سے زیادہ کوئی مہربان نہ تھا) حضور اکرم صلعم کو حضرت بی بی فاطمہ رضؓ بنت اسد کے (جو اولین دور کی مسلم خواتین میں شامل تھیں، بعمر ۷ سال) انتقال کی اطلاع ملنے پر آپ نے ان کے کفن کے لیے اپنا کرتہ اتار کر عنایت فرمایا۔ تدفین سے قبل حضور اکرم صلعم کچھ دیر کے لیے ان کی قبر میں لیٹ گئے پھر قبر سے اُٹھ کر ان کی میت کو مزار میں اتروایا۔ (مزید تفصیلات کے لیے طبقات ابن سعد جلد

صحابیات ملاحظہ فرمائیے)

قبر میں لیٹنے کے بعد خالدی محترم نے کیا محسوس کیا جب بھی تصور کرتے اس کی یاد اور اس کا قلبی تاثر پھر تازہ ہو جاتا۔ وہ کبھی کبھی یاد کر کے اس کا ذکر کرتے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے چپ ہو جاتے!

وہ اپنی کشتیٔ حیات کے خود ہی ناخدا تھے اور خود ہی کھیون ہار! اب تو تنہائی دوئی سے بدل گئی تھی۔ ذمہ داری کا بوجھ کندھوں پہ عائد ہو چکا تھا۔ انھوں نے ابتداءً سنہ ۱۹۳۹ء میں مترجم کی حیثیت سے دارالترجمہ میں ملازمت اختیار کرلی۔ یہیں مولوی سید ابوالخیر مودودی مرحوم سے دوستی ہوئی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء - ۱۹۷۹ء) سے تجدید ملاقات اور بعد میں قلمی اور علمی رابطہ قائم رہا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں جامعہ عثمانیہ کے تاریخ اسلام کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمن کے انتقال کے بعد آپ کا بحیثیت استاذ تاریخ اسلام انتخاب عمل میں آیا اور اپنے ہی شفیق استاد کے جانشین مقرر ہوئے اور اسی شعبہ سے بحیثیت ریڈر سنہ ۱۹۷۶ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اس زمانے میں حکومت سرکار عالی کی جانب سے منتخب ذہین اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھیجا جاتا تھا۔ آپ نے بجائے یورپ کے مصر جانے کو ترجیح دی تاکہ عربی ادب میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کرسکیں۔ چناں چہ آپ نے سنہ ۱۹۴۶ء میں جامعہ فواد الاوّل حال معروف بہ نام جامعۃ القاہرہ میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۴۹ء ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کر کے اپنے وطنِ مالوف اور اپنی خدمت پر واپس ہوئے۔ وہ تادمِ زیست تاریخ، زبان، ادب اور قرآن کی خاموش خدمت کرتے رہے۔ نہ کسی ستائش کی تمنا کی نہ صلہ کی پروا! نہ شہرت کے خواہاں رہے نہ نام و نمود کے طالب! ہجومِ افکار ہے اور خیالات کا امڈتا ہوا سیلاب! کیا کیا لکھوں؟ کیسے لکھوں؟

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی پیدائش ہی میں بڑا پن اور عظمت

آشکار ہوتی ہے اور وہ کسی نہ کسی علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہوتے ہیں اور علمی گہوارے سے ہیں نہ صرف آنکھ کھولتے ہیں بلکہ اسی میں پرورش پاکر آسمانِ علم و ادب پر آفتاب و ماہ تاب بن کر چمکتے ہیں۔ لیکن چند ایک قابلِ ستائش اور لائقِ صد آفریں ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جو وقت کی بھٹی میں تپ کر کندن بن کر ابھرتی ہیں اور موجِ حوادث سے نبرد آزما ہوکر افقِ علم و آگہی کی کہکشاں میں شامل ہوجاتی ہیں۔ قابلِ تقلید ہیں ایسی نادرۂ روزگار عظیم شخصیتیں جنھوں نے اپنے بل بوتے پر اپنی محنت و لگن، والہانہ جذبے اور جانفشانی سے بلندیوں اور ارتقا کی حدوں کو چھو لیا ہے۔ دکن کی سرزمین سے ابھرنے والی جامعۃ القاہرہ کی اس لائقِ احترام عالمانہ شخصیت کا شمار بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ انھوں نے ایک سپاہی گھرانے میں آنکھ کھولی لیکن اپنی ان تھک محنت اور جنون کی حد تک علمی شغف سے اہلِ علم کے قافلہ سالار بن گئے۔ مادرِ گیتی ایسے سپوتوں پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔!

ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی علم و فن، فکر و نظر، دانش و حکمت، فراست و بصیرت کے ایسے پوشیدہ خزانے کا نام ہے جسے بہت کم لوگوں نے جانا اور کم ہی لوگوں نے پہچانا۔

وہ جب دارالترجمہ سے وابستہ ہوئے تو اسی "مدینۃ العلوم" (ماہ لقابائی چندا کی جاگیر۔ اڈکمیٹ) کے پرسکون اور روح پرور، خیال انگیز اور دلکشا ماحول میں چند سال انجینیرنگ کالج کے عقب میں رہائش اختیار کی پھر جامعہ عثمانیہ کوارٹرز میں مدتِ ملازمت تک مقیم رہے۔ وہ کم گو اور بہت کم آمیز تھے۔ زندگی کی صعوبتوں، وقت کی لامتناہی آزمائشوں، زمانہ کے سرد و گرم اور شخصیت کی خودساختگی نے انھیں خاموش فطرت اور تنہائی پسند بنادیا تھا۔ وہ مردم بیزار نہیں تھے۔ البتہ تنک مزاج ضرور تھے۔ اپنے ہم مذاقوں کی محفل میں خوب کھلتے تھے۔ ان کی خاموشی، نازک مزاجی اور تنگ ظرفی نے

لوگ انھیں مغرور اور انا پسند سمجھتے تھے۔ یہ بات خلاف واقعہ ہے معلومات اور علمیت پر خود اعتمادی انانیت تو نہیں کہلا سکتی؟ کسی بھی قسم کی کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا اعتراف کرنے میں کبھی تامل محسوس نہیں کرتے۔ یہ خود ان کی بڑائی کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر خالدی محترم دل کے صاف، بات کے کھرے وعدہ کے پکے، ارادہ کے قوی اور وقت کے بہت پابند تھے۔ عادات واطوار اور معمولات میں نظم وضبط کی عادت، علمی دیانت داری، راست بازی اور حق گوئی ان کے ذاتی جوہر تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے سحر خیزی کی عادت ہو چکی تھی اسی لیے بلا لحاظ موسم ہر روز صبح کم سے کم ۲۰ تا ۳۰ منٹ چہل قدمی (بجز شدید علالت) کبھی ناغہ نہ ہوئی اور یہی معمول شام کا بھی تھا۔ دوپہر میں لازماً قیلولہ کرتے۔ روزمرہ کے معمولات میں سر مو فرق نہ آنے دیتے مقررہ اوقاتِ ملاقات کے علاوہ غیر اوقات میں کسی سے نہ ملتے۔

چائے نوشی کا ان کا اپنا مخصوص اور منفرد ذوق تھا۔ چائے عمدہ اور اعلیٰ قسم کی اور بہت اہتمام سے پیتے تھے۔ آنے والوں کی تواضع میں دریغ نہ کرتے۔ نمازوں میں سوائے نمازِ ظہر کے حتی الامکان جماعت سے ادا کرنے کا اہتمام کرتے مصر میں دورانِ قیام پتہ میں پتھری آگئی تھی جسے عملیہ کے بعد نکال دیا گیا تھا ڈاکٹروں کے مشورہ کی بناء پر مصر سے واپسی کے بعد روزوں کا اہتمام نہیں کر سکے۔ فی الجملہ ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اکثر آنتوں کی سوزش کا عارضہ لاحق رہتا۔ ملنے والوں کا عام تاثر یہ رہا کرتا کہ وہ بے حد خشک مزاج تھے لیکن بات بالکل اس کے برعکس تھی۔ وہ اپنے قریبی ہم نشینوں میں ہنسی مذاق اور سنجیدہ مزاح سے لطف اندوز ہوتے۔ اپنے ہم مزاج احباب کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ ضیافتیں منعقد ہوتیں کہیں پاٹ لک ہے تو کہیں نہاری شیرمال کا دسترخوان۔ ان نشستوں میں علمی گفت وگو کے ساتھ شعر وسخن سے بھی محفل گرم رہا کرتی۔ انھیں صحبتِ ناجنس بہت ناپسند تھی۔ وہ ہم خیال قدیم احباب کی محفل الگ ترتیب دیتے تو کبھی جامعہ کے ساتھیوں کی نشست علاحدہ!

قدیم یادیں تازہ کرنے کے لیے مسجد چوک میں دوستوں کے افطار کا انتظام کرتے۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے کے مصداق لذتِ کام ودہن کے ساتھ لطفِ صحبت اور عقل ودانش کی تفریح کا خیال رکھتے عام ضیافتوں میں کم شریک ہوا کرتے اگر جاتے بھی تو کچھ نہ کھاتے کیوں کہ ایسے موقعوں پر انھیں نشستن وخوردن وبرخاستن والی بات کبھی نہ بھاتی!

ہمیشہ پرہیزی کھانا کھاتے۔ لباس کے مقابلے میں بہترین اور عمدہ غذا پر زیادہ توجہ دیتے۔ خوراک نہایت مختصر اور مقدار میں کم ہوتی تھی۔ شہد سے غیر معمولی رغبت تھی۔ شہد کی خوبیوں اور افادیت کے قطع نظر اتباعِ سنّت میں اس کا روزانہ استعمال غذا کا جزُ تھا۔ اسے مسنون، مفید اور شافی الامراض سمجھ کر کبھی ترک نہیں کیے۔ کھانے کے بعد پیلے موز کا استعمال ان کا معمول تھا۔ وہ میٹھے کے شوقین نہیں تھے لیکن کھانے سے فراغت کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھا ضرور کھاتے۔ انھیں میگھ راج [حیدرآباد کے قدیم مٹھائی فروش واقع چارمینار جانب مشرق] کی مٹھائیاں بہت پسند تھیں۔ موسم میں عمدہ قسم کے کھجور مرغوب تھے۔ ہر قسم کا میوہ اپنے موسم میں شوق سے کھاتے۔ آم ان کا سب سے زیادہ پسندیدہ میوہ تھا۔ موسم گرما میں تربوز بکثرت استعمال کرتے۔ کھانے پینے میں بہت اچھا، عمدہ اور منفرد ذائقوں کا خیال رکھتے تھے مزاج میں عام اعتبار سے نرالاپن اور انفرادیت تھی طبیعت میں سختی، درشتی کی حد تک پائی جاتی تھی۔ وہ روزانہ آٹھ تا دس گھنٹے مطالعہ اور علمی مشاغل میں مصروف رہتے۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ اکثر کتب بینی میں مستغرق اور تحقیقی کاموں میں منہمک نظر آتے۔

اسی وسعت علمی اور مطالعہ کی گہرائی نے علمی اور دینی حلقے کے مخصوص گروہ کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ مولانا حکیم سید عبدالباقی شطاریؒ (م ۲۲ر نومبر ۱۹۷۳ء) ڈاکٹر میر ولی الدین (م ۱۹۷۵ء) ڈاکٹر عبدالمعید خان (م ۱۹۷۳ء) ڈاکٹر سید وحید الدین صاحب مظہر احسن گیلانی مرحوم (م ۱۹۷۷ء) ڈاکٹر نصیب قریشی مہا

ڈاکٹر جعفر نظام صاحب (سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ اور وائس چانسلر کاکتیہ یونی ورسٹی) ڈاکٹر صالح محمد علاء الدین صاحب (پروفیسر جامعہ عثمانیہ) ڈاکٹر ہاشم امیر علی (م ۱۹۸۷ء) ڈاکٹر عبدالرفیع ظفر صاحب، سید حسن عسکری صاحب، شیخ بلیغ الدین حسین صاحب استاذی سید محمود علی صاحب (فینانس آفیسر جامعہ عثمانیہ) اور مولانا محمد عبدالرزاق لطیفی مرحوم (م ۱۹۷۵ء) اور دورِ آخر میں پروفیسر انوار الرحمٰن صاحب وغیرہ علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی نشستوں کے درخشاں ستارے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اسلامی دنیا کے ملکی اور غیر ملکی مشاہیر و علماء سے گرما گرم مباحث کی محفلیں ہوا کرتیں اور بیشتر نامورانِ علم و ادب سے خط و کتابت کا سلسلہ رہا کرتا، ڈاکٹر ہانس کروز اور ڈاکٹر ڈبلیو۔سی۔ اسمتھ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز میک گل یونیورسٹی جیسی قابل شخصیتیں آپ کی معلومات اور وسیع مطالعہ کا اعتراف کرتے ہیں مولانا عبدالماجدؒ دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی محترم نے بھی آپ کے علمی کاموں کی ستائش اور قدر افزائی فرمائی ہے۔

حسن اتفاق سے ایک دفعہ مولانا عبدالماجدؒ دریابادی ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ خالدی محترم نے مولانا کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اہل علم اور مخصوص اہلِ ذوق شریک تھے جن میں مولانا سید عبدالباقی شطاریؒ، رفیقِ دیرینہ سید عمر قریشی مرحوم، ڈاکٹر میر ولی الدین مرحوم، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے چھوٹے بھائی مظہر احسن گیلانی مرحوم، سید حسن عسکری صاحب اور یہ خاکسار شامل تھے۔ مولانا نماز عصر کے بعد تشریف لائے۔ چائے نوشی ہوئی۔ مغرب کی نماز باجماعت پڑھی۔ کچھ دیر بعد کھانا ہوا۔ دیر گئے تک علمی گفتگو رہی۔ اس طرح یہ خوشگوار صحبت اور یادگار علمی محفل کا سلسلہ عصر سے عشاء تک جاری رہا۔ اور مولانا واپس تشریف لے گئے۔ ہائے افسوس ع

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا

اس کی یادیں اب بھی ذہن میں تازہ معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا نے حیدر آباد سے اپنی واپسی کے بعد "صدق جدید" کی اشاعت اکتوبر ۱۹۶۳ء شمارہ ۱۱ جلد ۴ میں اپنے تاثرات "سفر دکن" کے عنوان سے اس طرح تحریر فرمایا :-

"شعبہ تاریخ اسلام کے استاد ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی اپنے رنگ میں سب سے منفرد ہیں۔ بڑے مخلص گہرے مذہبی۔ اپنا دل کھول کر رکھ دینے والے ساتھ ہی بڑے پڑھے لکھے۔ کہاں کہاں کی کتابیں دیکھ ڈالنے والے۔ قرآنیات کے سلسلہ میں دو ایک کتابیں ایسی ہدیۃً پیش کر دیں جو اس کے قبل کہیں نظر سے نہیں گزری تھیں۔ جزاہ اللہ! دعوت تو ایسی کی کہ دوسروں کے لیے نظیر اور قابلِ تقلید۔ یعنی کھانا نہایت لذیذ لیکن بس دو ہی ایک چیزیں۔ یہ نہیں کہ عام رواج کے مطابق دس چیزیں سامنے لاکر رکھ دیں، معدہ اس تعدد و تنوع سے الگ خراب ہو اور نیت پھر بھی نہ بھرے کہ اپنے پسند کی کوئی ایک چیز بھی سیر ہو کر نہ کھائی جا سکی، بس اسراف ہی اسراف ہاتھ آیا....."

(مولانا عبد الماجد دریا بادی۔ گیارہ سفر: سیاحت ماجدی کلکتہ: ادارہ انشائے ماجدی ۱۹۸۰ء) (تاثرات دکن۔ بہادر یار جنگ اکاڈمی: کراچی)

مذکورہ تاثرات خالدی محترم کے ذوق خورد و نوش کے علاوہ ضیافت کے سلیقہ اور کتابوں کی دنیا میں "دید و دریافت" کے لیے سند سے کم نہیں۔ ان کی دور بینی اور عمیق نظر اور وسیع مطالعہ کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا۔

کسی بات کی تحقیق کے سلسلہ میں اپنی علالت کے دوران اپنے آخری دور کے ایک شاگرد سید ابراہیم صاحب سے خط لکھوا کر مولانا علی میاں کے نام بھجوایا تھا۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنے جواب مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۸۵ء میں تحریر فرمایا تھا :-

"......مولانا ابوالنصر محمد خالدی صاحب مسلمانوں اور ہندوستان کا علمی سرمایہ اور قیمتی متاع ہیں۔ میں ان کی دقتِ نظر اور تحقیقی کاموں کا پرانا قدر داں ہوں۔ ان کی علالت و تکالیف کی اطلاع سے تکلیف ہوئی۔ یہ بیماری بڑھاپے کی عام بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام امراض سے شفاء عطا فرمائے...... محترمی خالدی صاحب کی صحت سے مطلع کیجئے گا۔" شرحدستخط

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

پروفیسر ڈبلیو۔ سی اسمتھ (ہارورڈ یونی ورسٹی) نے صاحبزادہ عمر خالدی کے نام اپنے پیام تعزیت میں لکھا ہے :۔

"Saints abide by god, and he was surely one of them."

میرا قلم عاجز ہے کہ کچھ لکھوں۔ کیا مذکورہ رشحات خامہ دو آتشہ نہیں ہو جاتیں ؟ کیا یہ "مقام خالدی" کے لیے طرۂ افتخار نہیں ؟

خالدی محترم کی ایک عادت تھی کہ وہ خطوط کا جواب لکھ چکنے کے بعد ان کے موسومہ خطوط کو چاہے وہ کسی بھی مشہور علمی شخصیت جیسے مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم، مولانا ابوالخیر مودودی مرحوم، مولانا عبدالماجدؒ دریابادی، ڈاکٹر ڈبلیو۔ سی اسمتھ، ڈاکٹر ہانس کروز وغیرہ وغیرہ کے ہوں چاک کر دیا کرتے۔ کسی بھی علمی، ادبی شخصیت یا مشاہیر دیگر علمائے دین سے مراسلت کا کوئی خط محفوظ نہیں۔

علم و فضل کے ذکر کے ساتھ یادوں کے کچھ اور پھول مہک اٹھے جو آپ کے گلدستۂ خیال کے لیے پیشِ خدمت ہیں۔ جامعۃ القاہرہ میں تحقیقی مقالے کے لیے ۶۵۔۶۷ھ کی نامور شخصیت، منتقم قاتلانِ حسینؓ، مختار ابن ابی عبید الثقفی (المقتول فی سنہ ۶۷ھ) کی تھی۔ اس کی حیات اور کارناموں پر تین سالہ

تحقیق کے بعد مقالے کی پیشکشی پر عربی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی تھی۔ اس درس گاہ کے قابل ترین اساتذہ سے عربی ادب کی شہکار کتابیں پڑھیں جن میں قابلِ ذکر البیان والتبیین : جاحظ، الکتاب سیبویہ، الأمالی، ابو علی القالی البغدادی ہیں۔ اس وقت مصر میں شام و سحر کی رنگینیاں تھیں۔ ہرطرف شوخی اور دلبری۔ نظارۂ جمال بھی تھا اور شوقِ وصال بھی۔ اطراف نظر دوڑاؤ پُرکیف ماحول، سرمایۂ ہوش و خرد چھیننے والا۔ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن آپ پر کسی کا سحر نہ چل سکا۔ اپنے قیمتی وقت کو مقصدی کام میں مصروف رکھے۔ وہاں کے عجائبات اور نوادرات اور قابلِ دید تاریخی مقامات، اہرام مصر وغیرہ پہلے دیکھنے کی بجائے ان کی عبیر ہندوستان کو واپس سے پہلے کی اسی دوران وہاں اطلاع پہنچی کہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو والد بزرگوار نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مصر میں تین سالہ دورانِ قیام میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے مصر میں جتنی بھی مسجدیں تھیں ان میں کسی نہ کسی وقت کی نماز ادا کی۔

بیرونِ ملک سے واپس ہونے والوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے لیے قیمتی تحفے اور بچوں کے لیے بدیسی کھلونے لائیں گے۔ لیکن جب خالدی محترم مصر سے لوٹے تو ان کے ہمراہ دو بنڈی (بیل گاڑی) کتابوں کے سوا اور کوئی سوغات نہیں تھی۔ (اس زمانہ میں حیدرآباد میں باربرداری کے لیے بنڈیوں کے استعمال کا رواج تھا) جب معلوم ہوا کہ بچے آزردہ ہیں تو کھلونوں کی دوکان سے لڑکوں کو گولہ اور ہاکی اسٹک اور لڑکیوں کو آنکھیں جھپکانے والی بولتی گڑیاں دلادیں۔ "اہلیہ سیدانی" کے حق میں تو آپ کی مسکراہٹ ہی بڑی دولت تھی! یوں تو بات معمولی معلوم ہوتی ہے اور عجیب بھی! لیکن یہ ان کی افتادِ طبع کی غمازی کرتی ہے کہ ان کو کتابوں سے کتنا عشق اور وارفتگی تھی۔

تب ہی تو مولانا دریابادی نے نادر ذخیرہ کتب کی داد دی تھی۔ خالدی محترم اکثر حضرت صفی اورنگ آبادی، مولوی سید قطب الدین احمد محمودی

اور راجہ حضرت کا تذکرہ بڑے خلوص اور احترام سے کیا کرتے تھے۔ اپنی تعلیم و تربیت میں حضرت صفیؔ کی مشفقانہ سرپرستی کا ذکر کرتے تو فرماتے تھے کہ "میرا سلیقہ، میری نفاست پسندی اور رکھ رکھاؤ مولوی صاحب کی حُسنِ تربیت کا مرہونِ منت ہے"۔ صفیؔ مرحوم کے منجملہ اور اوصافِ حمیدہ کے غیرت اور خودداری کی صفت نے کبھی کسی سے ذلتِ سوال گوارا نہیں کیا۔ ان کا یہ شعر ان کی فطرت کی ترجمانی کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔ ؎

آبرو کھو کر کوئی کیوں اہلِ دولت سے ملے
پاؤ ٹکڑا لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

استاد کی طبیعت اور تربیت نے خالدی محترم کو بھی اسی سانچے میں ڈھالا لیکن ان کے مزاج میں لاابالی پن اور شوریدگی کی بجائے استقلال و استقامت تھا۔ صفیؔ مرحوم کے انتقال تک آپس میں روابط قائم رہے۔ وہ حسب توفیق ان کی خدمت کیا کرتے تھے لیکن کسی پر ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اسی حقِ تلمذ کی پذیرائی میں کلامِ صفیؔ اورنگ آبادی کے انتخاب کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا ذکر ان کی سوانح عمری (مرتبہ جناب نورالدین خان صاحب) کے صفحہ ۹۰ اور ۹۱ پر کیا گیا ہے۔ مجھے یہاں شرکائے کمیٹی کے ناموں کے انکشاف میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ڈاکٹر خالدی محترم مولانا سید عبدالباقی شطاریؒ، سید عمر قریشی مرحوم، غلام علی حادی مرحوم (جانشین حضرت صفیؔ م ۵ مارچ ۱۹۶۹ء) میر بہادر علی جوہر مرحوم (م ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء) ڈاکٹر غلام معین الدین یوسفی مرحوم (م یکم مئی ۱۹۵۹ء) اور راقم الحروف اشعار پر زبان و بیان، سلاست و روانی، رنگِ تغزل، محاوروں کی چستی، معنوی گہرائی اور گیرائی، جدتِ فکر اور ندرتِ خیال غرض ہر نکتہ اور ہر پہلو سے بحث و گفت و گو ہوتی اور منتخب کلام کو قلم بند کیا جاتا۔ اس عاجز کو مرتب شدہ منتخب کلام کی صاف نویسی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ افسوس کہ چند وجوہات کی بنا پر یہ انتخابِ کلام زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا اور خالدی محترم نے

راقم الحروف کے ذریعہ ادارۂ ادبیات اردو میں محفوظ کروا دیا تاکہ تلف ہونے سے بچ جائے اور محققین کے کام آئے۔ حضرت صفی کے منتخب کلام کے مجموعے کی طرح آپ نے ان کے قابل حصول اور فراہم کردہ خطوط اور تحریروں کو بھی اسی ادارہ کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ کروا دیا۔ وہ اپنی جامعاتی اور تحقیقی کاموں کی وجہ سے خواہش کے باوجود ان خطوط کو شائع کرنے سے قاصر رہے جن کی حیثیت ادبی دستاویزات سے کم نہیں۔

اسی طرح احسان شناسی یا جذبہ خدمتِ استاد کی خاطر اپنی ذاتی سعی و کوشش سے مولوی سید قطب الدین احمد محمودی مرحوم کو دارالترجمہ میں "سیرت ابن ہشام" کے ترجمے کا کام تفویض کروایا۔ کسی کو کانوں کان خبر ہونے نہ دی کہ یہ ان کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ یہ کامیاب ترجمہ چار جلدوں پر محیط ہوا۔ جن میں سے جلد اول اور جلد دوم شائع ہو سکے اور بقیہ دو حصے اشاعت سے محروم رہے۔ دارالطبع جامعہ عثمانیہ نے ۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۵۷ف میں سیرت ابن ہشام کے ترجمہ کی جلد اول شائع کی جو (۵۹۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتداء "سلسلۂ نسب پاک صلعم" سے شروع ہو کر "رکانہ المطلبی کا حال رسول اللہ صلعم سے (اس کی کشتی)" پر ختم ہے۔ جلد دوم جو (۶۷۱) صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۴۹ء م ۱۳۵۸ف میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد کا آغاز "اسراء یعنی رات کا سفر اور معراج کے بیان" سے ہوتا ہے اور "محیصہ اور حویصہ کا حال" پر ختم۔ سقوط حیدرآباد کے بعد حالات کی کایا پلٹ ہوگئی۔ دارالترجمہ میں سن ۱۹۵۴ میں آتشزدگی کا واقعہ پیش آیا۔ یہ حادثہ حیدرآباد مرحوم کی علمی دنیا اور قیمتی اثاثے کا ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ بیش قیمت اور نادر کتابیں آگ کی نذر ہوگئیں۔ جو بچ رہیں ان میں نیم جھلسی کتابیں بھی تھیں اور جزوی آگ زدہ بھی! ان کتابوں کا ہراج ہوا۔ کچھ بازار میں آئیں اور زیادہ ذخیرہ نفع خور تاجروں کے قبضے میں۔ چند ایک اونے پونے فروخت ہوگئیں اور بیشتر اہم اور نایاب کتابیں پاکستان کے کتب فروشوں تک پہنچ گئیں۔ جس طرح اور بہت

ساری کتابوں کے ترجمے اب دستیاب نہیں اسی طرح "سیرت ابن ہشام" کا ترجمہ بھی حیدرآباد دکن میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے! خارجاً مسموع ہوا ہے کہ تیسری اور چوتھی جلد کا تصحیح شدہ غیر مطبوعہ ترجمہ مولوی سید قطب الدین احمد محمودی مرحوم کے فرزند مولوی سید محمود مکیؔ عرف قبلہ پاشا کے ہاں موجود ہے جو کراچی میں مسندِ رُشد و ہدایت پر فائز ہیں۔ اللہ علیم ہے کہ یہ غیر مطبوعہ ترجمہ محفوظ بھی ہے یا دیمک کی خوراک بن گیا ہے! حنبلی مسلک کے یہ مولوی صاحب غلو کی حد تک بڑے ہی کٹر قسم کے مذہبی متقی اور صوفی بزرگ تھے اپنی ذات سے انجمن اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک! "سائنس اور تصوف" کے علاوہ "نماز کا برقی نظام الٰہی" کی تصنیف ہے۔ بٹوارہ کے بعد پاکستان ہجرت کئے اور وہیں انتقال فرما گئے "سائنس اور تصوف" پر مفسر قرآن مولانا محمد عبدالقدیر صدیقیؒ نے تبصرہ فرمایا تھا اور "نماز کا برقی نظام" پر مولانا عبدالماجدؒ دریابادی نے اپنی گراں قدر رائے شائع فرمائی تھی۔

یہاں ایک اور ہستی کا ذکر ناگزیر معلوم ہوتا ہے جن سے خالدی محترم نے علمی مسائل میں استفادہ کیا ہے۔ وہ ذاتِ گرامی ہے عالم باعمل، زہد و تقویٰ کے پیکر افضل العلماء مولانا سید عبدالباقی شطاریؒ کی! جو زمانہ کی ناقدری کا شکار رہی اور جن کا شمار اس صدی کی تابندہ اور برگزیدہ شخصیتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ علامہ محمد جمال الدین نوری مرحوم اور مولانا عبدالواسع مرحوم کے مایہ ناز اور قابلِ فخر شاگرد تھے۔ وہ علوم مشرقیہ کے جید عالم اور طب، منطق، فلسفہ، علم کلام، فقہ، حدیث اور تفسیر کے ماہر گزرے ہیں۔ مولانا جہاں علمِ مناظرہ کے شاطر رہے ہیں وہیں کشتی اور بنوٹ کے ماہر بھی تھے۔ موسیقی میں ایسا کمال علم حاصل تھا کہ استادانِ فن آپ کا ادب کیا کرتے تھے۔ مزاج میں حد درجہ انکسار اور شہرت و ناموری سے ہمیشہ احتراز!

خالدی محترم اور مولانا کی یکجائی قران السعدین سے کم نہ تھی۔ ان کی صلاحیتوں سے علمی فیض رسانی کی خاطر دارالترجمہ کے ذریعہ "مباحث مشرقیہ" کے ترجمے کا کام مولانا کے ذمہ کروایا۔ چناں چہ امام فخرالدین محمد بن عمر رازی (م ۶۰۶ھ) کی شہرہ آفاق تصنیف "مباحث مشرقیہ" کے حصہ اول کا اردو ترجمہ ۱۹۴۹ء میں حصہ دوم کا ۱۹۵۰ء میں دارالطبع جامعہ عثمانیہ کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اس کے نسخے بھی اب عدم دستیاب ہیں۔ اسی طرح خالدی محترم کی ترغیب اور تحریک پر مولانا سید عبدالباقی شطاری نے حسب ذیل کتابوں کا بھی ترجمہ فرمایا تھا۔

ابن جماعۃ (م ۷۳۳ھ) کی "تحریر الاحکام فی تدبیر اہل اسلام" اس رسالہ کا اردو ترجمہ "اسلامی نظم و نسق" کے نام سے اسلامک پبلشنگ ایجنسی سلطان شاہی حیدرآباد کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ جس کا مقدمہ خالدی محترم نے لکھا تھا اور اس مقدمہ کی علمی حلقہ میں غیر معمولی داد و تحسین ہوئی تھی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (الرئیس الاعلیٰ جامعہ فواد الاول قاہرہ) کی خود نوشت سوانح حیات "الایام" حصہ اول اور حصہ دوم۔ انجمن ترقی اردو ہند علیگڈھ نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔

یحییٰ ابن آدم القرشی (م ۲۰۳ھ) کی مولفہ کتاب الخراج۔

اسی طرح عربی زبان کی اور بھی نادر و نایاب کتابوں کے ترجمے پیش نظر تھے لیکن حالات اور سیاسی مد و جزر نے دارالترجمہ کے انمول جواہر کو زیور طبع سے آراستہ ہونے کا موقع نہیں دیا۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔ مولانا کے تعلق سے اتنی بات مزید عرض کروں گا کہ تاریخ علمائے دکن میں اس صدی کی بہت سی شخصیتیں ملیں گی لیکن ان کی جیسی متوکل، زاہدانہ اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے والی شخصیت کی مثال شاید ہی ملے! مولانا کے ذاتی کتب خانہ میں فارسی اور عربی کی بیش بہا کتابوں کا اتنا ذخیرہ تھا کہ ان کے وسیع اور کشادہ دارالمطالعے

کی دلداریں "علمی زر و جواہر کے سربہ مہر خزانوں" کی الماریوں کے پیچھے چھپ گئی تھیں کیسی گل سرسبد ہستیاں تھیں یہ!! افسوس کہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو ان کی رحلت کے بعد اس دانش گاہ علم و عرفان کا انمول کتب خانہ ایسا اُجڑا کہ اہلِ ذوق دولتِ علم کے ان سنہرے اوراق کو دیکھنے کے لیے ترس گئے۔ اس دانستہ غفلت کے ذمہ داروں کو زمانہ کبھی معاف نہیں کرے گا!

سرگذشت بالکل ادھوری رہ جائے گی اگر خالدی محترم کے یارِ غار ہم دم دیرینہ، ہم راز و دم ساز، لڑکپن کے ساتھی، ساتھی بھی ایسے کہ تادمِ زیست بے مثال رفاقت، دکھ سکھ کے شریک جناب سید عمر قریشی مرحوم (م ۱۹۸۴ء) کا مختصر حال نہ لکھوں۔ موصوف نے ابتداء سے ایثار و قربانی کے جذبے کے ساتھ عمر بھر ایسی دوستی نبھائی اور حق دوستی ادا کیا کہ دوستی بھی شرما جائے! ذکر گزر چکا کہ خالدی محترم کے سازِ حیات کے سوز و گداز کے دور میں مسجد چوک کے یہی ساتھی تھے۔ دوست کی خاطر اپنے گھر کا سکھ چین چھوڑا اور مسجد میں آٹھیرے۔ وہ بیڈمنٹن کے اچھے کھلاڑی اور خالدی محترم کی طرح بہترین پیراک تھے۔ فارسی میں ماہر اور عربی میں مولانا شطاریؒ کے چہیتے شاگرد۔ شوقین طالب علموں کو مفت پڑھاتے تھے۔ اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کو چھپانے والے۔ کم سخن اور کم آمیز۔ غیر معمولی خودداری کے حامل اور قدیم وضع داری کا ایسا نمونہ کہ ان کی ہستی نادرۂ روزگار سے کم نہیں تھی! ان کی ملازمت کے بارے میں اتنا بتا دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف محکموں میں کارگزار رہے اور آخر میں محکمہ کمرشیل ٹیکس سے وظیفۂ حسن خدمت پر علاحدہ ہوئے۔ مرحوم عبد الرؤف خاں برادر عبد القیوم خاں مرحوم پرنسپل آئی ٹی آئی راستا پور، نواب اسلم خاں مرحوم جاگیردار، حکیم محمد للّٰہی صاحب اور غوث الدین صاحب فزیکل ڈائرکٹر جامعہ عثمانیہ شہرہ آفاق فزیوتھراپسٹ نہ صرف اسپورٹس کے ساتھی رہے بلکہ ان سے دوستی بھی تھی۔ محترم خالدی مرحوم کا خط اچھا نہیں تھا۔ وہ خود اپنے

خط کو خطِ جنّی کہا کرتے تھے۔ ان کی روانی میں لکھی ہوئی تحریر کے پڑھنے والے صرف دو۔ ایک مرحوم قریشی اور دوسرے راقم الحروف! کبھی کبھی تو وہ خود اپنی تحریر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اسی لیے لکھائی کا کام ہمارے ذمے ہوا کرتا۔ چناں چہ ہدیۂ ممنونیت اور اظہار رفاقت و دوستی اور اعترافِ تعاون کے لیے اپنے تصحیح و تقدیم شدہ "کلام معظم بیجاپوری" (مطبوعہ ۱۹۸۰ء) کے تعارف نامہ میں صفحہ (۷) پر ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب مدفیضہٗ کی مشفقانہ حذاقت کی تحسین کے بعد اس طرح رقم طراز ہیں۔

"میرے بچپن کے ساتھی اور نہایت شفیق و کریم دوست جناب سید عمر (قریشی) بن سید احمدؒ بن سید میرؒ بن سید بندگیؒ کی رفاقت کا ممنون ہوں کہ میرے حد درجہ شکستہ خط میں لکھے ہوئے مسودہ کو آپ ہی نے بیتصنہ میں تبدیل فرمایا۔" ۱۹۵۲ء میں جناب قریشی مرحوم کی اہلیہ داغِ مفارقت دے گئیں۔ وہ اس عظیم صدمے کو سینے میں چھپائے بوجھل زندگی گزارتے رہے اور ۱۹۸۴ء میں حج کے لیے کیا گئے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ارضِ مقدس کے مہمان بن گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝ مرنے والوں کے کارنامے تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انھیں بھلانا چاہے بھی تو بھلائے نہیں جا سکتے! یہ وہ یادگارِ زمانہ لوگ تھے جن کے حالات اور کارناموں پر علاحدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر خالدی محترم نے تاریخ، ادب، اسلامیات اور دکنی ادبیات پر مختلف عنوانوں کے تحت بیشتر فنی، علمی اور تحقیقی مقالے اور مضامین تحریر کیے جو اردو کے معیاری جرائد و رسائل جیسے مثلاً جامعہ، نوائے ادب، زندگی، برہان، سب رس اور کاروانِ ادب (کراچی) وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تفصیل آگے درج کی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ نے دریائے علم کی غواصی کر کے تلاش و جستجو کے بعد

قرطاس و قلم کے ذریعہ کیسے کیسے گوہر آبدار سے علمی دنیا کو زینت بخشی ہے۔ انھوں نے ۱۷ر رمضان ۱۳۹۵ھ کو اپنے وصیت نامہ میں لڑکوں کو مخاطب فرما کر تحریر کیا تھا کہ

"میری تالیفیں بہت تھوڑی ہیں۔ سب کی طباعت ناقص ہے جب کبھی تم کو توفیق ہو تم میں سے کوئی ایک یا سب مل کر کم از کم ایک مرتبہ ان سب کو ایک یا چند اجزاء میں بہتر سے بہتر طباعت کے بعد شائع کروادیں ...... اللہ تعالیٰ نے مجھے جتنا علم دیا تھا اس کے مطابق میں خدمت نہیں کر سکا جس کا مجھے دلی افسوس ہے"۔

اللہ انھیں توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس وصیت پر عمل کرکے علمی وراثت کے تحفظ اور اشاعت کی جلد از جلد کوئی صورت نکالیں۔

وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللّٰہ

پچھلے اوراق میں راقم نے یہ لکھا تھا کہ خالدی محترم اپنے موسومہ خطوط کو چاک کر دیا کرتے تھے چاہے وہ کسی بھی نامی گرامی شخصیت کی جانب سے ہوں لیکن حال ہی میں میسور کا دورہ کرنے پر خاکسار کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ رفعت محترم جب کبھی بھی حیدرآباد میں ہوتے تو ان مذکورہ خطوط میں سے چند ایک حاصل کر لیا کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ ان کے ذاتی خطوط کے پلندوں میں پائے گئے جو ان کے پاس کسی نہ کسی طرح آج تک محفوظ رہے۔ معلوم نہیں ان میں کن کن جلیل القدر شخصیتوں کے کتنے خطوط تھے، کتنے ضائع ہوگئے اور کتنے بچ گئے؟ ان میں سے ہمیں جو بھی مہیا ہوگئے انھیں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ نصف صدی کی مدت کچھ ناقابل قیاس مدت نہیں ہوتی! اس وقت جب کہ کوئی ذاتی گھر نہیں، کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں! کبھی حیدرآباد میں تو کبھی اورنگ آباد میں، کبھی گلبرگہ میں تو کبھی میسور اور بنگلور میں! گویا زندگی کیا ہوئی سندباد جہازی کا سفر ہوا! تو اتنی طویل مدت تک ان خطوط کی حفاظت خود اولاً رفعت محترم کا اور

ان کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ اور فرزند اکبر کا نہ صرف ایک عظیم اور انمٹ کارنامہ ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے ایک بے مثال ادبی یادگار بھی ہے! بایں ہمہ اگر یہ راقم الحروف اپنی کھوج اور تلاش سے سینکڑوں خطوں کے ڈھیر میں سے انھیں ڈھونڈ کر نکالا نہ ہوتا تو ہرگز نہ انھیں مضمون میں شامل کر پاتا اور نہ کبھی کسی اہلِ فکر دفن کی رسائی ان خطوط تک ہو سکتی! نہ جانے ذخیرۂ علمی کے ان خزانوں میں اور کتنے لعل و گہر ہماری نظروں سے پنہاں اور دست رس سے دور ہیں؟ خدا انھیں زمانے کی دست برد سے بچائے رکھے اور اس سے استفادہ کے لیے کسی اہلِ خرد کو جنوں آشنا کر دے! یہ چند انمول خطوط اس حقیر خادم ادب کے حوالے کرنے پر رفعت محترم کی اہلیہ اور ان کے نیک نام ہر دلعزیز فرزندِ ارجمند عزیزی ڈاکٹر سید نظام الدین صاحب اسد کا دلی شکر گزار ہوں کہ اس طرح انھوں نے اپنے اخلاص اور ادب نوازی کا ثبوت دیا۔

ان خطوط میں اہم اور قابلِ ذکر مولانا مودودی کے خطوط ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمۃ کی شہرۂ آفاق عالمگیر شخصیت محتاجِ تعارف نہیں البتہ ان کے برادرِ حقیقی مولانا سید ابوالخیر مودودی مرحوم سے سوائے علمی حلقے اور طبقۂ علماء کے موجودہ دور کے عام قاری غالباً واقف نہیں ہونگے اس لیے اجمالاً عرض ہے کہ وہ بھی ایک جیّد عالم تھے اور عرصہ تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے وابستہ رہے۔ انہوں نے تاریخ اسلام کی اہم ترین کتابوں کا ترجمہ کیا تھا جن میں حسبِ ذیل چار کتابیں دارالطبع جامعہ عثمانیہ کی جانب سے شائع ہوئیں:۔

[۱] کتاب الخراج: قدامہ بن جعفر۔ مطبوعہ ۱۹۳۰ء (درسی کتب برائے بی اے)

[۲] فتوح البلدان: البلاذری۔ حصہ اول و دوم۔ مطبوعہ ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۴ء (برائے ایم اے)

[۳] تاریخ طبری: تاریخ الامم والملوک۔ جلد اول۔ ابن جریر الطبری مطبوعہ ۱۹۳۶ء (درسی کتب برائے بی۔ اے)

[۴] تاریخ کامل ابن اثیر :- ابن الاثیر الجزری - مطبوعہ ۱۹۳۸ء
[برائے بی - اے]

ان کے علاوہ آپ کی غیر مطبوعہ تراجم کی بھی تفصیل ہے۔ ان بزرگوار کے خصائلِ حمیدہ اور اوصافِ جمیلہ کی ایک جھلک کا اندازہ اس روایت سے فرما لیجئے جس کے راوی خالدی محترم تھے۔ بیان فرماتے تھے کہ مولانا ابوالخیر دارالترجمہ کو تانگے میں آیا جایا کرتے تھے۔ وہ اس قدر غریب پرور اور انسانیت نواز تھے کہ جب کبھی وہ دارالترجمہ سے اپنے گھر واپس ہوتے یا جہاں کہیں بھی جاتے تو کبھی تانگے والے کو چکایا نہ کرتے بلکہ مقام کا نام بتا کر بیٹھ جایا کرتے اور منزل پر پہنچنے کے بعد تانگے والے کو منہ مانگا کرایہ دے دیتے۔ اس طرح ہر تانگہ والا ان سے خوش رہتا اور خواہش کرتا کہ ان ہی کی سواری ملے۔ کبھی کبھی تو اس کے لیے تانگے والے آپس میں صرف تکرار ہی نہ کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے سے جھگڑتے بھی تھے۔ مولانا انھیں چپ کرا کے کسی بھلے آدمی کے تانگے میں چلے جاتے۔ اس ایک مثال سے غور فرمائیے کہ وہ کتنے سلیم الطبع اور رحم دل تھے۔

مولانا مودودیؒ کے یہ مکتوبات اکابرینِ جماعتِ اسلامی، رفقائے کار معتقدین اور محققین کے لیے معلومات میں اضافہ کے ساتھ بہت اہم، قابلِ قدر، لائقِ وقعت اور تاریخی دستاویزی حیثیت سے کم نہ ہوں گے۔
لیجئے ملاحظہ فرمائیے :-

---

[۱]

ملتان روڈ - لاہور ۱۹ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

محترمی و مکرمی! السلام علیکم۔
یاد فرمائی کا اور آپ کے مشوروں کا شکریہ۔ "سیاسی کشمکش" کے ہر دو حصوں کا ملخص ترجمہ انگریزی میں ہو رہا ہے انشاء اللہ عنقریب شائع ہو گا۔

ڈاکٹر لطیف کی اسکیم میں چند قباحتیں ہیں جن کو میں ابھی بیان کرنا خلافِ مصلحت سمجھتا ہوں۔ مسلم لیگ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد انشاء اللہ ان پر بحث کروں گا۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا وقت ہے۔ میں ایک سیاسی پرچہ نکالنے کی فکر کر رہا ہوں۔ حالات کی مساعدت کا انتظار ہے۔

گوہن کی کتاب میں نے ابھی تک نہیں دیکھی۔ اگر آپ مستعار عنایت فرمائیں تو شکر گزار ہوں گا۔

legacy of Islam کے جس باب کا آپ ترجمہ فرما رہے ہیں وہ مکمل ہونے کے بعد میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں انشاء اللہ اسے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کروں گا۔

خاکسار

ابو الاعلیٰ

[۲]

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"۔ لاہور　　　مورخہ ۲۴ ار رمضان ۱۳۵۸ھ

محترمی و مکرمی!　　السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا ایک عنایت نامہ پہلے اور دوسرا (کارڈ) بعد میں وصول ہوا مگر کچھ مدت سے مجھ پر مصروفیتوں کا ایسا غلبہ رہا کہ جواب دینا تو درکنار بسا اوقات خطوط کو پوری طرح پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ بہرحال اتنی طویل تاخیر کے لیے بجز شرمندگی کے اور کیا پیش کر سکتا ہوں۔

لیگیسی آف اسلام کے مقالہ پر جو حواشی میں نے لکھے تھے ان میں لہجہ کی تلخی جن حضرات نے محسوس کی انہوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ مصنف کی جن باتوں پر یہ تلخی ظاہر ہوئی ہے وہ باتیں بجائے خود ایسی ہی تھیں۔ مغربی مصنفین میں یہ بیماری بکثرت پائی جاتی ہے [اور یہی اس مقالہ کے مصنف میں بھی موجود ہے] کہ یہ لوگ

اپنے قیاسات اور ظنون کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا ثابت شدہ حقائق ہیں۔ یہ طریقہ سراسر علمی دیانت کے خلاف ہے، اور اس پر صاف تنبیہ کرنا ضروری ہے۔

سائنس اور ریاضی پر اس کتاب میں جو مقالہ ہے اس کا شائع ہونا بلاشبہ مفید ہوگا مگر چوں کہ "ترجمان القرآن" کے موضوع سے اس کا ربط نہیں ہے۔ لہٰذا اس رسالہ میں اس کی اشاعت کچھ بے جوڑ سی ہوگی۔

آپ کے مقالہ کی پانچ کاپیاں زائد نکلوانا تو مشکل تھا، کیوں کہ پریس سے اگر ہم پانچ زائد کاپیوں کا مطالبہ کریں تو وہ ہم سے کم از کم ڈھائی سو کاپیوں کی اُجرت طلب کریں گے۔ البتہ یہ ضرور ممکن تھا کہ آپ کو دو چار کاپیاں رسالہ کے ہر اس نمبر کی بھیج دی جاتیں جس میں یہ مضمون شائع ہوا تھا، بشرطیکہ آپ اسی زمانہ میں، جب مضمون کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تھا، براہِ راست منیجر کو لکھ دیتے۔ مگر آپ نے مجھے لکھا، اور میری مشغولیت کا حال اگر آپ کبھی خود مشاہدہ فرمائیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے کہ ان معاملات میں میرا مبتلائے نسیاں ہو جانا ایک طبعی امر ہے جس میں میرے قصد وارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ فی الواقع ماہ جمادی الاولیٰ کا پرچہ ناپید ہو گیا ہے۔ اس کے ماسوا دوسرے پرچے آپ کو بھیج سکتے ہیں، مگر اس کے مہیا ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ آپ مکتبہ ابراہیمیہ اور معظم جاہ مارکیٹ کے سامنے سید محمد مختار صاحب مالک کارخانہ "نمک لاجواب" کے ہاں دریافت فرمائیں۔ اگر وہاں سے جمادی الاولیٰ کے ایک دو پرچے مل جائیں تو منیجر صاحب کو لکھ کر باقی مہینوں کے پرچے یہاں سے طلب فرمالیجیے گا۔

آپ کی کتاب نیشنلزم ان دی ایسٹ واپس بھیج رہا ہوں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

[1]

کوچہ پنڈت۔ دلی ۱۷ مئی ۱۹۴۲ء

مکرمی۔ تسلیم!

جمعرات کو ساڑھے بارہ بجے دلی پہنچ گیا۔ راستہ بہت آرام سے طے ہوا۔ ریلوے کا نظام اوقات بہت بگڑ گیا ہے۔ آٹھ بجے صبح کو پہنچنے کا وقت تھا۔ ساڑھے بارہ بجے دن کو دلی جنکشن پر گاڑی پہنچی۔ یہاں کے اور حیدرآباد کے موسم میں کوئی فرق نہیں ہے عام حالات بدستور ہیں۔ شہر میں کوئی خوف و ہراس نہیں ہے۔ بعض سڑکوں پر پناہ گاہیں بن رہی ہیں لیکن رات کو شہر میں کہیں کبھی (کرم خوردہ) کیا جاتا۔ ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ یہاں اب تک اندھیر نگری چوپٹ راج نہیں ہے۔ یہاں ۲۷ مئی تک ٹھیروں گا۔ پندرہ بیس دن اِدھر اُدھر پھر کے واپس آؤں گا اور اس کے بعد لاہور جاؤں گا۔

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

ابوالخیر (مودودی)

[2] بسم اللہ الرحمن الرحیم

(تاریخ ندارد)

مکرمی السلام!

دونوں کتابیں بشکریہ واپس کی جاتی ہیں۔ سید احمدؒ کو بڑی کلفت سے تمام کیا۔ کاش سیرت نگار غلو نہ کرتے۔

سائنس مولانا کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد واپس کردوں گا۔ ترجمہ ـــ اشک آور گیس کے وزن پر ـــ رشک آور ہے

رائے کا حق تو اس کے لیے ہے جو علم رکھتا ہو۔

ابوالخیر

[۳] کوچہ پنڈت، دلی۔   ۲۸/ جون ۴۲ ۱۹ء

محبّی! السلام علیکم

براہِ کرم اپنی اس کتاب کا مسودہ بھیج دیجیے جو آپ نے "مسلمانوں کی تہذیب" پر ترجمہ فرمائی ہے۔ جامعہ والوں سے گفت و گو ہوئی تھی ملاح درچین وکشتی در خراسان کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہی اس گفت و گو کا نتیجہ رہا۔ معاوضہ کا تعین بھی فرما دیجیے کہ قطعی معاملت ہو سکے۔ مقدمہ پروفیسر مجیب سے لکھوا لیا جائے گا۔

حیدر آباد میں تو ایک شب میں تین انچ بارش ہو گئی یہاں بقدر یک بال بھی اب تک بارش نہیں ہوئی۔ بادل امنڈ امنڈ کے آتے ہیں لیکن ان کی بھی وہی حالت ہے جو برطانوی آٹھویں رجمنٹ کی ہے۔

حفیظ جالندھری صاحب حکومت ہند کے شعبہ میں نظم نگاری و نظم آرائی کے انچارج ہو گئے ہیں۔ خدا روس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے کہ اس کی بدولت سامراج کو اشتمالیوں کا تعاون حاصل ہو گیا اور تعاون کی بدولت آل انڈیا ریڈیو ان کا ملجا بن گیا کارل مارکس لینن کی روح اپنے ان فرزندوں سے کتنی خوش ہو گی۔

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

ابوالخیر (مودودی)

[۴]

کوچہ پنڈت، دلی   ۵/ مارچ ۱۹۴۳ء

جانشین استاد۔

خط ملا۔ آپ کی اطلاع بہت پرانی ہے اتنی پرانی جتنے ہڑپہ اور موہنجو دارو کے آثار! گھر میں پریشان ہیں میرا خط نہ آنے سے۔ پریشانی حق ہے لیکن میرے پاس اس کا علاج نہیں ہے میں خط بھیجتا رہتا ہوں۔ علاج کیا بتاؤں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر دم ہر سانس کے ساتھ لیکن کوئی ... ایسا نہیں جاتا جس میں ایک

عدد لفافہ کو چہ نیڈت سے ناراین گوڑہ نہ جاتا ہو۔ نہ پہنچے تو میں اس کو کیا کروں۔ میں تو صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ خط لکھوں اور ڈاک کے صندوق میں جس کو لیٹر بکس کہتے ہیں ڈال دوں۔ پہنچانا تو میری استطاعت سے باہر ہے۔ یہ خبر مجھے اس سے پہلے ہی مل چکی تھی۔ خط بھیج چکا ہوں اور حالات لکھ دیئے ہیں: والدہ صاحبہ حیدرآباد جانے کے لیے پٹھان کوٹ سے دلی آگئی ہیں۔ شاید اسی مہینے کے آخر میں یہاں سے سوئے حیدرآباد چل پڑیں۔

اور کہیے معلم تاریخ اسلام صاحب! کیسی گزرتی ہے؟ جس شغل کو آپ اپنے لیے مناسب سمجھتے تھے، اس سے ہم کنار ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے سچی لگن تھی اور کوئی موقع نہ ملا تو استاد ہی کو مار ڈالا۔ خالدؓ نے دین کی لگن میں کافروں کو تلوار سے مارا تھا، خالدی نے من موہنے شغل کی لگن میں استاد کو قوتِ ارادی سے مارا صورت بدلی ہوئی ہے مگر کام ایک ہی ہے۔ تنخواہ وہ نہیں ملتی جو ملنی چاہیئے تو بورژوا دنیا میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تو بورژوا فطرت کی خصوصیت ہے۔ رفعت صاحب اور شمشیر علی صاحب کو سلام۔

والسلام

(ابوالخیر) مودودی

شرح دستخط

[۵]

جالنہ ۹ر اسفندار (سن ندارد)

حبیب مکرم۔ السلام علیکم!

چاہتا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دوں لیکن نہ حیدرآباد سے اطلاع دے سکا نہ اورنگ آباد سے۔ اب جالنہ سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ گیارہویں ذی الحجہ کے دن ایک بجے

سفر اٹل ہوا اور شام کی گاڑی سے حالت سفر شروع ہو گئی۔ عاشق کی قیمت کا چکر میرے پاؤں میں آ گیا ہے اور لیے پھر رہا ہے۔ اورنگ آباد میں بہ مشکل دو دن قیام رہا۔ جنگ کی طرح میرا سفر بھی پھیل رہا ہے۔ ذی الحج کے تمام ہونے سے پہلے میرا سفر تمام ہوتا نظر نہیں آتا۔ بلکہ شاید حیدرآباد پہنچنے تک عشرۂ محرم بھی تمام ہو جائے۔

کاش آپ نے زحمت نہ فرمائی ہو اگرچہ آپ کی صحت سے اس کی اُمید کم ہے۔ یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ واپسی کے بعد شرفِ حضوری حاصل کروں گا۔ فقط

ابوالخیر (مودودی)

---

۱۹ ردے ۱۳۵۱ ف

[۱]

مکرمی!

کرم نامہ مورخہ ۲۶ شوال کا شکریہ۔ معذرت خواہ ہوں کہ جواب میں تعویق ہوئی۔ آپ نے ازراہِ نوازش میری نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کو آپ کے حسنِ ظن پر محمول کرتا ہوں کیوں کہ میں نے ابھی کیا ہی کیا ہے؟ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو اس وقت پورے ہو سکیں گے جب کہ آپ جیسے صاحبِ ذوق اور لائق اصحاب میرا ہاتھ بٹائیں گے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کی قلمی اعانت کے قواعد و ضوابط اور معاوضہ وغیرہ سے متعلق ایک کتابچہ معلومات شائع ہو چکا ہے جو غالباً میں نے مبارز الدین صاحب کو دیا تھا۔ اگر نہ دیا ہو تو انھیں کہہ دیجیے کہ مجھ سے آئندہ جب وہ ادارہ تشریف لائیں تو لے لیں۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

[۲] ادارۂ ادبیات اردو
۳ ستمبر ۱۹۵۷ء
خیریت آباد۔ حیدرآباد

محب مکرم ڈاکٹر خالدی صاحب

آپ کا ارسال کردہ رجسٹر مجلس اساتذہ وصول ہوا۔ جس کے لیے اپنے اور ادارے کی طرف سے دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

براہِ کرم اس طرح کے کاغذات اور کتابیں مرحمت فرماتے رہیں۔

اس کو آپ کے نام سے بطور عطیہ درج کیا جائے یا نہیں اطلاع بخشیں۔

صفی صاحب مرحوم کے خطوں کا کام اچھا ہو رہا تھا، آپ نے رکوا دیا۔ بڑا کیا۔

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

جو بھی خطوط ہیں بھجوا دیجیے۔ ترتیب و تبویب بعد ٹائپ بھی ہو سکتی ہے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

گورنمنٹ کالج۔ بنگلور   یکم جنوری ۱۹۷۰ء

حبیب صدیق! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۲۷ دسمبر کا مکتوبِ گرامی نامہ میرے میسور کے پتہ پر ملا۔ محمود میسور گئے تھے، وہ واپس آتے ہوئے یہ گرامی نامہ لیتے آئے۔ الحمدللہ کہ اس اطلاع سے یک گونہ اطمینان ہوا کہ آپ کا مزاج فی الجملہ بہتر ہے۔

مولانا آزاد کی کتاب پر تبصرہ لکھنا آپ کے لیے دشوار نہ

تھا لیکن آپ کی گرتی ہوئی صحت کے مدِ نظر زحمت انگیز ضرور تھا۔ آپ نے اچھا ہی کیا کہ کتاب لوٹا دی۔

پرسی براؤن کی کتاب کے ترجمہ کا کام بالکل رُک گیا۔ بہت سے اسمائے خاص کے لیے کچھ اصطلاحوں کے لیے بعض فنی باتیں اپنی سوجھ بوجھ سے بالاتر معلوم ہونے کی وجہ سے۔ اب "ہرگز" کی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا فنِ تعمیر" پر تکیہ کئے بیٹھا ہوں۔ خدارا اپنے شعبہ کے کتب خانہ سے یا یونی ورسٹی کے کتب خانہ سے یہ کتاب لے کر مجھے بھیج دیجئے۔ اسے آپ جب لوٹانے کے لیے فرمائیں انشاء اللہ قطعی طور پر جلد لوٹا دوں گا۔ میری اس گزارش پر ہمدردانہ توجہ فرمایئے۔ اب آپ کے سوا حیدرآباد میں میری یہ درخواست کوئی اور پوری نہیں کر سکتا۔ ورنہ آپ کو زحمت نہ دیتا۔ آپ کی توجہ فرمائی کا ازبس محتاج ہوں' زیادہ کیا عرض کروں۔

اللہ نے آپ کو ایک اور ذمہ داری سے سبک دوش فرمایا' اس کی مبارک باد۔ اب دُعا گو ہوں کہ آخری فریضہ سے بھی آپ اِسی طرح بحسن و خوبی سبک دوش ہو جائیں انشاء اللہ۔ اسامہ (خالدی) سلمۂ کے یورپ جانے کا کیا ہوا، مجھے یہ جاننے سے دلچسپی ہے۔

والسلام مع الاکرام

آپ کا

رفعت

خالدی محترم کے نام ان مختصر خطوں کے مطالعہ سے اس دور کی باہمی دوستی، آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم، اخلاص علمی رجحانات، مشاغل اور ادبی فضا نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ فی الحال ان چند خطوط کی دستیابی تاریکی میں جگنوؤں سے بڑھ

کر ہے۔ اگر اور شخصیتوں کے مکتوبات فراہم ہو جاتے تو زندگی کے کچھ اور پہلو روشن ہوتے!

آئیے اب ان کی مطبوعات اور غیر مطبوعات کی فہرست دیکھتے چلئے :۔

اسلامیات

۱: خالد بن سنان العبسی :۔ برہان۔ جلد ۳۲ [اپریل ۱۹۵۴ء] ص ۱۹۷ - ۲۱۲، جلد ۳۲ [مئی ۱۹۵۴ء] ص ۲۶۴ - ۲۷۶

۲: مذاہب کا تقابلی مطالعہ : کیوں اور کس طرح :۔ برہان۔ جلد ۴۹ [اپریل ۱۹۶۲ء] ص ۱۴۲ --- ۱۵۶

۳: قاموس الوفیات لاعیان الاسلام:۔ برہان۔ جلد ۵۸، [مئی ۱۹۶۷ء] ص ۲۷۴، ۲۹۰، جلد ۵۸ [جون ۱۹۶۷ء] ص ۳۴۸ - ۳۵۸، جلد ۵۹ [اگست ۱۹۶۷ء] ص ۸۴، ۱۰۰، جلد ۵۹ [ستمبر ۱۹۶۷ء] ص ۱۴۸ - ۱۶۱، جلد ۵۹ [نومبر ۱۹۶۷ء] ص ۲۷۷ - ۲۸۸، جلد ۵۹ [دسمبر ۱۹۶۷ء] ص ۳۴۵ - ۳۶۶ جلد ۶۲ [فروری ۱۹۶۹ء] ص ۷۷، ۹۲، جلد ۶۲ [مارچ ۱۹۶۹ء] ص ۱۶۹ - ۱۸۴، جلد ۶۲ [اپریل ۱۹۶۹ء] ص ۲۵۵ - ۲۷۰ -

۴: اصلاح کلام۔ حالی کی شاعری :۔ جامعہ۔ جلد ۶۴ [نومبر ۱۹۷۱ء] ص ۲۳۶ - ۲۵۰۔

۵: مسیحیوں اور یہودیوں کے علاوہ دوسری کونسی ملتیں اہل کتاب کے زمرے میں داخل ہو سکتی ہیں : زندگی ۔ جلد : ۴۸ [جون ۱۹۷۲ء] ص ۴۰ - ۵۲

۶: ادبی مصادر میں آثار عمر بن رض: ـ برہان ـ جلد ۱۷ [جولائی ۱۹۷۳ء]
ص ۶ ـ ۲۳، جلد ۷۴ [مارچ ۱۹۷۵ء] ص ۱۸۲ ـ ۱۸۸، جلد ۷۴
[اپریل ۱۹۷۵ء] ص ۲۴۶ ـ ۲۵۲، جلد ۷۴ [مئی ۱۹۷۵ء] ص ۳۰۳ ـ
۳۱۲ جلد ۷۴ [جون ۱۹۷۵ء] ص ۳۵۵ ـ ۳۶۷، جلد ۷۵ [جولائی
۱۹۷۵ء] ص ۴۳ ـ ۵۲ جلد ۷۵ [اگست ۱۹۷۵ء] ص ۱۱۱ ـ ۱۲۰
جلد ۷۵ [اکتوبر ۱۹۷۵ء ص ۲۳۷ ـ ۲۴۹ ـ

۷: قرآن مجید کی رجائیت انگیز آیتیں: ـ زندگی ـ جلد ۵۰ [ستمبر
۱۹۷۴ء] ص ۱۰ ـ ۱۶

۸: قرآن مجید میں نباتی الفاظ: ـ زندگی ـ جلد ۵۰ (اکتوبر ۱۹۷۵ء)
ص ۳۳ ـ ۴۰

۹: قصیدہ "بردہ": کعب بن زہیر: برہان جلد ۸۲ (مارچ ۱۹۷۹ء)
ص ۱۴۲ ـ ۱۵۶

دکنیات

۱۰: خاص الفقراء: ـ برہان ـ جلد ۵۰ (جون ۱۹۶۳ء) ص ۳۳۸ ـ
۳۵۳، جلد ۵۱ (جولائی ۱۹۶۳ء) ص ۲۵ ـ ۴۸ جلد ۵۱ (اگست ۱۹۶۳ء)
ص ۷۶ ـ ۹۴ جلد ۵۱ (اکتوبر ۱۹۶۳ء) ص ۱۴۶ ـ ۲۹۶

۱۱: کچھ دکنی کلام: ـ نوائے ادب ـ جلد ۱۵ (جولائی/ستمبر ۱۹۶۴ء) ص ۲۶ ـ ۵۸

۱۲: کلام معظم بیجاپوری: ـ اردو قدیم ـ جلد ۱ (۱۹۶۵ء) ص ۲۲۲، ۲۸۲ ـ ۲۴۲

۱۳: گلسر نامہ از سب رس ـ جلد ۲۸ (اکتوبر ۱۹۶۵ء) ص ۲۳ ـ ۴۰

۱۴: چند دکنی مثنویاں: ـ دکن کی اسلامی تہذیبی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت
سے ـ سب رس ـ جلد ۲۹ (جنوری ۱۹۶۶ء) ص ۴۱ ـ ۴۸ جلد ۲۹ (فروری ۶۶ء)
ص ۹ ـ ۱۶، جلد ۲۹ [مارچ ۱۹۶۶ء] ص ۱۷ ـ ۲۴، جلد ۲۹ [مئی
۱۹۶۶ء] ـ

ص ۲۵ - ۳۲، جلد ۲۹ (جون ۱۹۶۶ء) ص ۳۳ - ۴۰ ۵۲: ۶۳
۱۵: قصیدہ آئین گجراتی :۔ نوائے ادب ۔ جلد ۲۱ (اکتوبر ۱۹۷۰ء) ص ۵۵
۱۶: معجزہ فاطمہ :۔ نوائے ادب ۔ جلد ۲۲ (اپریل ۱۹۷۱ء) ص ۵۵
۱۷: مخمس از سیلان :۔ نوائے ادب ۔ جلد ۲۲ (اپریل ۱۹۷۱ء) ص ۵۵ - ۶۱
۱۸: معظم کی مثنویاں :۔ برہان ۔ جلد ۶۷ (ڈسمبر ۱۹۷۱ء) ص ۴۱۱ - ۴۲۸
جلد ۶۸ (جنوری ۱۹۷۲ء) ص ۴۲ - ۶۳، جلد ۶۸ (مارچ ۱۹۷۲ء) ص:
۱۹۵ - ۲۱۱، جلد ۶۸ (اپریل ۱۹۷۲ء) ص ۲۴۹ - ۲۶۳ - ص ۳۵، ۵۱
۱۹: قصہ تاختہ و یاز از طالب نوائے ادب ۔ جلد ۲۳ (جنوری ۱۹۷۳ء)
۲۰: رسالۂ وجودیہ از معظم نوائے ادب ۔ جلد ۲۳ (اپریل ۱۹۷۳ء) ص ۵۶ - ۶۵
۲۱: کلام معظم بیجاپوری ۔ حیدر آباد ۔ ۱۹۸۰ء

تاریخ

۱۸۵
۲۲: جنگ ملاذکرد ۔ مجلہ عثمانیہ ۔ جلد ۷ (شمارہ ۳/۴) ۱۹۳۴ء ص ۱۹۶
۲۳: وثائق ۔ روزنامہ وقت ۔ حیدر آباد ۔ سالگرہ اعلیٰ حضرت حضور نظام
میر عثمان علیخان نمبر (مورخہ ۵ر اپریل ۱۹۳۴ء) ص ۱ ۔
۲۴: تقویم ہجری و عیسوی :۔ دہلی ۔ انجمن ترقی اردو ہند ۔ ۱۹۳۹ء کراچی،
انجمن ترقی اردو پاکستان ۔ ۱۹۵۶ء، دہلی ۔ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۷۷ء
۲۵: مسلمانوں کی تہذیب ۔ حیدر آباد ۔ ادارہ دانش و حکمت ۔ ۱۹۴۴ء
۲۶: عظمتِ اسلام ۔ کراچی ۔ کاروان ادب ۔ ۱۹۵۲ء
۲۷: مقدمہ: اسلامی نظم و نسق ۔ [ابن جماعۃ (م ۷۳۳ھ مطابق ۱۳۳۳ء)
کی کتاب "تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام" کا اردو ترجمہ از مولانا حکیم
سید عبدالباقی شطاری ۔ اسلامک پبلشنگ ایجنسی حیدر آباد ۔ ۱۹۵۹ء]
۲۸: ہندوستان کے متعلق جاحظ کے اجمالی معلومات کا تفصیلی مطالعہ :۔
[illegible] ۴۷ (جولائی ۱۹۶۱ء) ص ۵ - ۲۴، جلد ۴۷ (اگست ۱۹۶۱ء)

ص ۶۹ ۔ ۸۸ ، جلد ۴۷ [ستمبر ۱۹۶۱ء] ص ۱۳۳ ۔ ۱۵۲ ، جلد ۴۷ [اکتوبر ۱۹۶۱ء]
ص ۱۹۷ ۔ ۲۱۶ ، جلد ۴۷ [نومبر ۱۹۶۱ء] ص ۲۶۱ ۔ ۲۸۰ ، جلد ۴۷ [دسمبر ۱۹۶۱ء]
ص ۳۲۵ ۔ ۳۳۶ ۔

۲۹ : تاریخ عادل شاہی [فارسی] از سید نور اللہ ۔ حیدرآباد ۔ اعجاز پریس ۱۹۶۴ء
۳۰ : مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں : بعض اساسی معلومات اور ان کی توضیح ۔۔۔ دہلی ندوۃ المصنفین ۔ ۱۹۷۴ء

غیر مطبوعہ کتابیں !

۳۱ : تذکرۃ الملوک ـــــ رفیع الدین ابراہیم شیرازی [فارسی]
۳۲ : احوال سلاطین بیجاپور [فارسی] ۳۳ : نظام الملک طوسی ۔ ایم اے کا مقالہ
۳۴ : وفیات اعیان الہند ۳۵ : عبدالملک بن مروان [م ۸۶ھ] اور ان کے زمانے کی سیاسی حالت ۳۶ : مختار ابن ابی عبید الثقفی : مقالہ برائے ڈی ۔ لٹ ۔ جامعۃ الملک فواد الاول ۔ قاہرہ ۱۹۳۹ء ۳۷ : دکنی مثنویاں ۳۸ : چرخ : نعتیہ قصیدہ از نصرتی ۳۹ : عربی صرف ۴۰ : الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم از مقاتل بن سلیمان بلخی [م ۱۵۰ھ] کا اردو ترجمہ ۴۱ : ضمائر القرآن ۴۲ : قرآن میں الکاف تشبیہہ ۔

مذکورہ اشاعت طلب کتابوں کے علاوہ قرآن حکیم کی تفہیم اور مطالعے کے لیے بعض ایسے نئے اور مختلف عنوان پیش نظر تھے جن پر ابھی تک کام نہیں ہوا تھا ۔ ان کے خاکے ، مختصر نکات اور یادداشتیں بیاضوں میں محفوظ ہیں جن کی توضیح و ترتیب مرحوم کی ہدایت اور رہبری کے بغیر ممکن نہیں ۔ کوئی اہل جانشین بھی نہیں کہ انھیں علمی استفادہ کے لیے کارآمد بنا سکے ۔ بڑی تمنا اور حسرت رہی کہ ان تحقیقی اور قلمی کاوشوں کو اپنے ہاتھوں تشنگان علم کی نذر کریں ۔ لیکن صحت کی خرابی اور پیغام اجل نے اتنی مہلت نہ دی ۔ خالدی محترم کے زیر نگرانی کتنے ہی طالب علموں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی اور تحقیقی میدان میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کر کے مختلف جامعات میں فائز ہوئے ۔ وہ اردو ، فارسی اور عربی زبان

و ادب کے ماہر ہونے کے باوصف فرانسیسی بھی جانتے تھے۔ آپ نے بدیسی امریکن جرمنی، فرانسیسی شوقین طالب علموں کو اردو بھی سکھائی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے طویل تدریسی دور میں شاگردوں کی بلاشبہ ایک طویل فہرست ہوگی۔ میں اپنی واقفیت کے مطابق چند ایسے شاگردوں کا ذکر کروں گا جن سے دیرینہ روابط قائم رہے۔ ان میں سید عبدالرحمٰن صاحب (پروفیسر و صدر شعبہ تاریخ اسلام کراچی یونی ورسٹی) سید غلام محمد نظام الدین مغربی مرحوم (پروفیسر شعبہ علوم اسلامی مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ۔ م ۱۹۸۹ء) ڈاکٹر شریف النساء انصاری صاحبہ (صدر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ) ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی صاحب (صدر شعبہ اردو گلبرگہ یونی ورسٹی) پروین رخسانہ صاحبہ (گلبرگہ) عبدالغنی صاحب (گلبرگہ) ڈاکٹر محمد علاء الدین صاحب (انوار العلوم کالج حیدرآباد) ڈاکٹر نجم الدین علی خان صاحب اور قاضی سید حمایت المقیت صدیقی صاحب شامل ہیں۔

تاریخ انگلستان کے علاوہ تاریخ اسلام برسوں پڑھاتے رہے علم الیقین حاصل تو تھا ہی، عین الیقین سے حق الیقین کی منزل طے کرنے کے لیے ان تاریخی اور یادگار مقامات مقدسہ کا دورہ کرنے کی دیرینہ خواہش تھی جن سے تاریخ کا انقلابی اور زرّیں عہد وابستہ تھا۔ چنانچہ پیرانہ سالی کے باوجود مکہ سے حرکت اور خدا سے برکت حاصل کرنے کی آرزو میں سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور آپ نے ۱۹۷۹ء میں بلادِ اسلامیہ کے دورہ پر رختِ سفر باندھا اور اسی سال فریضۂ حج ادا کیا۔ یہ سفر وسیلۂ ظفر شام، دمشق، استنبول اور حجاز پر مشتمل تھا۔ قدیم و جدید مطبوعہ کتابوں کی جستجو کی۔ چند ایک خریدیں اور بعض کی قیمت نقد ادا کر کے فہمائش کی کہ بھنگی گھر پر بھیج دیں لیکن بددیانت تاجر رقم ہضم کر لیا اور کتابیں ندارد۔ مراسلت بے سود! آپ نے جامعہ عثمانیہ کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد "مطالعہ قرآن" کا ایک علمی حلقہ قائم کیا تھا اور باقاعدگی کے ساتھ اس کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس حلقہ کے شرکائے اکرام میں قابلِ ذکر حامد علی عباسی مرحوم

[م ۱۹۸۹ء] ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب، پروفیسر جعفر نظام صاحب، شیخ بلیغ الدین حسین صاحب، ڈاکٹر عبدالرفیع ظفر صاحب، انوارالرحمٰن صاحب، حامد احمد خاں صاحب، مولوی سید محمود علی صاحب اور سید ابراہیم صاحب ہیں۔

آپ کے اتنے وسیع کاموں میں رفقائے کار کی محنت شاقہ اور جگر سوزی کے ساتھ لائق تحسین ہیں آپ کی اہلیہ محترمہ جنھوں نے اپنی اطاعت شعاری، عملی تعاون، ایثار و قربانی اور صبر و ضبط کے انتھک جذبہ سے آپ کو دنیاوی فکروں سے آزاد رکھا تاکہ آپ کا زیادہ سے زیادہ وقت علمی مشاغل میں گزرے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس قدر علمی کام عمل جامہ نہ پہن سکتا۔ بعض تحقیقی کام برسوں کی محنت کا ثمرہ ہیں جیسے مثلاً "مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں" دوسری مصروفیات کے ساتھ قریباً پندرہ سالہ کوشش کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا کہ وہ کتابوں کے دلدادہ اور رسیا تھے انھوں نے اپنے کتب خانہ میں ایسی کمیاب، نادر اور قیمتی کتابیں اکٹھا کی تھیں جنھیں دیکھ کر اہل نظر عش عش کرتے تھے۔ یہ کتب خانہ "عجائب خانہ" سے کم نہیں تھا۔ وصیت کے مطابق یہ کتابیں امریکہ روانہ کردی گئیں۔ ان کے چھ لڑکوں اور چار لڑکیوں میں سبھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سب لڑکے امریکہ میں امریکی شہری کی حیثیت سے مقیم ہیں۔

وہ قوم و ملت کا درد رکھتے تھے۔ خاص طور پر مسلمانوں میں تعلیمی انحطاط اور تہذیبی اقدار کی زوال آمادگی پر اکثر رنجیدہ، دلگیر اور متفکر رہتے تھے۔ اس ضمن میں مختلف مسائل پر مختلف تنظیموں کے سربرآوردہ افراد آپ سے تبادلہ خیال کرتے اور آپ کے فلاحی، اصلاحی مفید اور کارآمد مشوروں سے مستفید ہوکر نئی راہ پاتے۔ وہ کشادہ ذہن، فراخ دل، روشن خیال جید عالم اور قرآنی علوم کا سرچشمہ تھے۔ انھیں اپنے حاصل کردہ دولتِ علم کے مطابق کام نہ کرسکنے کا ملال تھا۔ عمر کے دورِ خزاں میں کام کرنے کی ہمت و حوصلہ کی بحالی تھا۔

وہ نقاہت اور کمزوری کی حالت میں بھی تھکنے تک کام کیا کرتے۔ ان کی قوتِ ارادی مضبوط اور حوصلے بلند تھے۔ طویل علالت اور پیچیدہ امراض میں مُبتلا رہنے کے باوجود آخردم تک ان کا حافظہ قوی، ذہن بیدار اور یادداشت قابلِ رشک تھی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی دین وملت، ادب و قرآن کی خدمت میں گزاردی۔ وہ ہمیشہ گلشنِ اُمت اور دبستانِ اسلام کی آبیاری کرتے رہے۔ ان کا وجود ایک متاعِ بے بہا تھا جو ہم سے بتاریخ ۳/ نومبر ۱۹۸۵ء م ۱۹/ صفر ۱۴۰۶ھ بروز یکشنبہ چھن گیا۔ عجب اتفاق ہے کہ پیدائش بھی صفر کی اور دنیا سے سفر بھی ماہ صفر میں! وصیت کے مطابق سید محمود علی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی عصر کے بعد مہدی پٹنم سے جنازہ کو شہرِ خموشاں کی طرف درگاہِ حضرت سید محمود مکی زرد حسینی ٹیکری گلشن باغ لے گئے۔ راقم الحروف اور سید ابراہیم صاحب قبر میں اترے۔ سوگوار دلوں، اشکبار آنکھوں اور لرزتے ہاتھوں سے اس عالمِ باعمل کے جسدِ خاکی کو سپردِ لحد کیا۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی علم ودانش کا یہ آفتاب بھی منوں مٹی تلے ہمیشہ کے لیے چھپ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون ۝ ان کے بغیر "مطالعہ قرآن" کی محفلیں سونی ہوگئیں۔ وہ علمی مذاکرے بحث وتحیص کی نشستیں جن کے مرحوم روحِ رواں تھے، اب اُداس اور ویران ہوگئیں اور دلوں میں یادوں کی شمعوں کے سوا کچھ نہ رہا! لیکن انھوں نے "مطالعہ قرآن" کے جس علمی حلقہ کا چراغ روشن کیا تھا وہ انشاءاللہ روشن رہے گا۔ ہر زمانے میں شمع سے شمع اسی طرح روشن ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

انھوں نے دولت چھوڑی نہ کوئی مال وجائیداد۔ ان کا سرمایۂ حیات ان کا کتب خانہ تھا اور ان کا علمی ورثہ ہی ان کا سرمایہ! علمائے اکرام دنیا سے گزر جاتے ہیں لیکن ان کے نام اور کارنامے ان کی کتابوں اور علم وحکمت کے خزانوں میں ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہتے ہیں۔

کتنی عظیم اور شفیق ہستیاں، کتنے پُرخلوص اور ہمدرد لوگ، کیسے وقار

اور تمکنت والے چہرے، کتنے تابناک واقعات، کتنی فکر انگیز یادگار صحبتیں، کتنی خیال آفریں اور گرم مجلسیں، کیسی کیسی علمی ادبی اور شعری محفلیں میرے لیل و نہار کا جزو بن چکے تھے! انھیں میں ڈھونڈ کر لاؤں کہاں سے ؟!

افسوس کہ حیدرآباد ایسے عالی مرتبت بندگانِ خدا سے خالی ہوتا جارہا ہے جو نہ صرف حیدرآباد بلکہ مسلمانوں کے لیے باعثِ صد افتخار تھے جن سے شعر و ادب کی آبرو اور علم و عرفان کا وقار تھا!

یہ عاجز اپنے پراگندہ خیالات کو جیسے تیسے سپردِ قلم کیا۔ فرض کفایہ تو ادا ہوا۔ معلوم نہیں ان اوراقِ پریشاں سے ان کی روح کو شادمانی ہوگی یا مجھے پشیمانی ؟

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

دسمبر ۱۹۸۹ء